

TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222767

UNIVERSAL
LIBRARY

نقشِ اولین

طلبہ کُلیہ ونگل کاشمیری سٹا

زیرِ نگرانی

احمد حسین خاں صاحب پرنسپل کُلیہ ونگل

مدیر

سید اختر حسن ایم۔ اے لکچرار کُلیہ ونگل

نائب مدیر

سید شاہ بلینغ الدین متعلم سال دوم کُلیہ ونگل

مجلس تنظیمی

سال تعلیمی ۱۳۵۵ء

صدر

احمد حسین خاں صاحب پرنسپل کلیہ ورنگل

اراکین

سید اختر حسن ایم۔ اے۔ لکچرار کلیہ ورنگل (مدیر حصہ اردو)
مسٹر ببا شین ریڈر کلیہ ورنگل (مدیر حصہ انگریزی)
زین العابدین صاحب ریڈر کلیہ ورنگل (مہتمم)

طلبہ کے نمائندے

سید شاہ بلغ الدین صاحب متعلم سال دوم کلیہ ورنگل
مسٹر کشن راؤ۔ متعلم سال اول کلیہ ورنگل

فہرست

نمبر	مضمون	مضمون نگار	نمبر
۱	فہرست		۱
۲	پس منظر	اختر حسن ایم۔ اے	۲
۳	کلام بہترین	خان صاحب مولانا ابوالاثر حفیظ جالندھری	۳
۴	ہمارا جد سرکشن پر شاد شاہ آنجہانی	شیخ افضل محمد متعلم سال دوم ورنگل کالج	۴
۵	مغنیۃ (نظم)	صدر رضوی سانبی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی قدیم طالب علم ورنگل کالج	۵
۶	اردو کے جدید قصوں پر دوسری زبانوں کے اثرات	محمد محمود حسین ایم۔ اے کچہرا انگریزی عثمانیہ ٹرینیٹی کالج ورنگل	۶
۷	اندھا رومان (افسانہ)	رضیۃ بیگم	۷
۸	سلطان محمد قلی قطب شاہ اور تصوف	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم۔ اے بی، ایچ ڈی پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ	۸
۹	دعویٰ (نظم)	ساعر نظامی مدیر ماہنامہ ایشیا میرٹھ	۹
۱۰	ہمارا مطالعہ	محمد فصیح الزماں قریشی متعلم جماعت دہم ورنگل کالج	۱۰
۱۱	گلیہائے پریشاں (قطعات)	ماہر القادری	۱۱
۱۲	(۱) اورنگ زیب کا گولکنڈہ پر حملہ (۲) اور قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ (۳) ابوالحسن اور فتح گولکنڈہ کے نتائج	عبدلولو باب مسلم ایم۔ اے (جامعہ عثمانیہ)	۱۲
۱۳	آخری تحفہ	سید شاہ ولی اللہ حسین متعلم سال دوم ورنگل کالج	۱۳
۱۴	اقبال کا تصور خودی	محمد سمیع الزماں ورنگل کالج	۱۴
۱۵	گم شدہ لعل (افسانہ)	محمد فصیح الزماں قریشی متعلم جماعت دہم ورنگل کالج	۱۵
۱۶	نکات	امین حزیں سیالکوٹی	۱۶
۱۷	غزل	امین حزیں سیالکوٹی	۱۷

صفحہ	مضمون نگار	مضمون	نمبر
۷۵	صاحبزادہ میر مسعود علیخان متعلم سال دوم درنگل کالج	ملکیتِ دکن کا سائنسی مطالعہ	۱۸
۸۱	صاحبزادہ میر مسعود علیخان متعلم سال دوم درنگل کالج	غزل	۱۹
۸۲	یعقوب الرحمن عثمانی درنگل کالج	مصر کا مشہور شاعر ابوالاعلام مہری	۲۰
۸۶	سید شاہ بلخ الدین حسین متعلم سال دوم کلیہ درنگل	شکستہ دل (نظم)	۲۱
۸۸	آسور رادھا کرشنہ مورتی متعلم سال دوم کلیہ درنگل	فراستِ ریاضی	۲۲
۸۹	رالبدہ بیگم	غلط فہمیاں (افسانہ)	۲۳
۹۶	اختر ایم۔ اے	التجا (نظم)	۲۴
۹۷	(۱) سید عبدالکریم اختر متعلم سال اول عثمانیہ کالج	غزلیات	۲۵
۹۸	(۲) عظیم عثمانیہ		
	(۳) عظیم عثمانیہ		
۹۹	سید عبدالباقی حسینی متعلم جماعت نہم کلیہ درنگل	نسوانی تعلیم کی اہمیت	۲۶
۱۰۱	خواجہ محمد شمعون ششم	مکالمہ دولت و تعلیم	۲۷
۱۰۵	اختر حسن ایم۔ اے	بازگشت (افسانہ)	۲۸
۱۰۸	حکیم خواجہ محمد انیسعلیل ذبیح	طالب علم سے خطاب (نظم)	۲۹
۱۱۲	محمد اسد اللہ متعلم جماعت دہم (سی) عثمانیہ درنگل کالج	مشاہیر کے آخری الفاظ	۳۰
۱۱۳	روحش صدیقی	گل شاداں (نظم)	۳۱
۱۱۵	حسین علی متعلم سال دوم کلیہ درنگل	چہر ہائیں سر آغا خان	۳۲
۱۲۰	مولانا حسرت موہانی بی۔ اے (علیگ)	تبرکات (غزلیات)	۳۳
۱۲۱	عالمجناب احمد حسین خاں صاحب پرنسپل کلیہ درنگل	خطبہ افتتاحیہ	۳۴
۱۲۹	بلخ	کلیہ کی خبریں	۳۵

قواعد و مقاصد

- (۱) یہ رسالہ سال میں دو مرتبہ شائع ہوا کریگا
- (۲) دل آزار مذہبی اور سیاسی مضامین اور دل شکن تنقیدیں کسی صورت میں بھی شائع نہ کی جائیں گی
- (۳) اس رسالہ کا واحد مقصد طلبہ میں اردو و انگریزی زبان و ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنا اور ان کی مضمون نگاری کی صلاحیتوں کو نشو و نما دینا ہے
- (۴) طلبہ کے علاوہ ملک کے مشہور ادیبوں اور شاعروں کے رشتہات فکر بھی اس میں شائع کئے جائیں گے
- (۵) جملہ خط و کتابت مدیر رسالہ کلینہ ورنگل (حیدر آباد دکن) کے پتہ پر کی جائے
- (۶) چند سالانہ عوام سے مجامع اور طلبہ سے عبرت ہے

پس منظر

مجھ کو کل کالج کی نئی وضع اور جدید تراش خراش نے زیر نظر شمارہ کو اپنے پیش روں کی صف سے بالکل الگ کھڑا کر دیا، اب تک اُس کی زندگی نشیب و فراز کے ایک ایسے دور سے گزرتی رہی جہاں اُسے کسی منزل پر بھی سکون و قرار نصیب نہوا کبھی اُردو اور تلنگی کے دو راہہ پر اُس نے قیام کرنا چاہا۔ کبھی اُردو اور انگریزی کے دو آبہ پر اپنی منزل بنانی چاہی اور بھی صرف اُردو کے دامن میں پناہ لینی چاہی لیکن کہیں بھی اُس کے قدم جمنے نہ پائے۔ بالآخر راستہ کی ان تمام دشواریوں کو طے کرتا ہوا اب وہ ایک ایسے فراز پر پہنچ گیا ہے جہاں سے اُسے اپنی منزل مقصود صاف نظر آرہی ہے اور اب آگے اُس کا راستہ ہوا رہے۔ وہ اب اپنے مقاصد کے گونا گوں اور پیچ در پیچ الجھنے سے نکل آیا ہے۔ وہ تمام پادروا مقاصد جواب تک صرف زینت تحریر بنے ہوئے تھے اب ایک حقیقی اور زندہ مقصد کے لئے اپنی جگہ چھوڑ چکے ہیں

اب اُس کا ادعا صرف اس قدر ہے کہ وہ طلبہ کی علمی و ادبی کاوشوں کا نقیش اولین ہے۔ ہر ایا بھلا صیبا بھی ہے لیکن خلوص و صداقت کے ساتھ اپنے مقصد اور نصب العین کے دامن کو محکمے ہوئے ہے۔ مجلہ کا یہ جدید دور اُس کا یہ نیا اٹھان ارباب فوق کی قدر افزائی اور طلبہ کی دلچسپی اور توجہ کا محتاج ہے

طلبہ سے ہم چاہتے ہیں کہ نقیش میں زیادہ سے زیادہ طلبہ ہی کے مضامین شائع ہوں۔ دراصل یہ انہیں کا رسالہ ہے انہیں کے لئے ہے اور اسے انہیں کی مساعی کا آئینہ دار ہونا چاہئے

نقش کے معیار کے متعلق ہمیں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ اس میں نام نہاد ادب لطیف اور گُل و ملیل اور زلف و رخسار قسم کی شاعری کی گنجائش نہیں ہے۔ ہمارا رویہ سخن بالخصوص طلبہ کی جانب ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ طلبہ شاعری کے جھاڑھن کا ٹیس اپنا دامن الجھانے سے پرہیز کرینگے اور ایسا ادب پیش کرنے سے احتراز کریں گے جو نقالی اور فرسودہ خیالی کی چادر دیواری سے باہر نہ نکلتا ہو۔ جو نوجوان آگے چل کر اُردو کی کشتی کے ناخدا بننے والے ہیں انہوں نے اگر ابھی سے دریا کے بہاؤ اور بہاؤ کے رخ کو نہ پہچانا اور اُسی لحاظ سے اپنے بادبانوں کو ٹھیک نہ کر لیا تو سلامتی و عافیت کے ساتھ ساحل پر پہنچنا معلوم!

آج دنیا اضطراب و انقلاب کے ایک ایسے دور سے گزر رہی ہے کہ ہر چیز کے پُرانے اندازے اور قدیم معیار بیکار ہوئے جا رہے ہیں۔ اس انتشار اور بحران میں ادب کے قدیم نظریے اور اصول بھی متزلزل ہو چکے ہیں۔ آج اگر آپ اپنے ادب کو زندگی اور ماحول کا ترجمان نہ بنایا اور اُسے ماضی کے پادروا منہ دہنات اور تصورات میں اُجھائے رکھا تو یقین کیجئے کہ زمانہ کا زبردست ہاتھ آپ کی تمام کوششوں اور کاوشوں کو صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیگا۔ آپ جو کچھ لکھتے اُس میں زندگی کی صداقتوں کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ خیالی دنیاؤں اور مافوق الفطرت تصورات کا دور ختم ہو چکا ہے۔ ”بھاپ اور بجلی“ کے اس دور میں ادب بھی ”احمقوں کی جنت“ سے نکل کر زندگی کی بساط فکر و دانش کا مزن ہو رہا ہے

”نقش“ کے زیر نظر شمارہ میں طلبہ کے مضامین کم نہیں ہیں لیکن ان کا تناسب جتنا زیادہ ہوتا جائے گا اُسی قدر اطمینان بخش ہوگا۔ بعض طلبہ کے مضامین اگر معیار پر پورے نہ اُترنے کی وجہ سے شائع نہ کئے ہوں تو انہیں پست ہمت نہ بنانا چاہئے۔ لکھتے لکھتے ہی لکھنا آئے گا۔ موضوع کے انتخاب میں احتیاط سے کام لیجئے۔ اُسی موضوع کا انتخاب کیجئے جس پر آپ سمجھتے ہیں کہ آسانی کے ساتھ قلم اٹھا سکتے ہیں۔ اپنے ہی رنگ میں لکھنے کی کوشش کیجئے اور لکھنے کے بعد اُس پر بار بار نظر ڈالئے دوسروں کے اقوال اور اشعار سے اپنے مضمون کو سوار کرنے کی کوشش نہ کیجئے کس لئے کہ مستعار چیزوں سے آپ جو آرائش کریں گے وہ کبھی دلکش اور دلپذیر نہیں ہو سکتی اور اس طرح آپ کی ابجی اور تخماتی قوتیں بھی ابھرنے نہ پائیں گی۔

سہرورق اس تہ جہاں جلہ کلا سب لگا گیا اُسکی ترتیب تشکیل میں ملی کی گئی اُسکے لئے ایک نام تجویز کیا گیا وہیں سکے مرق کبھی یہ دینے نیکے سکے عور کیا گیا اور بالآخر سید محمد جعفر صاحب (انسپیکٹر آرٹ اینڈ کرافٹ) نے ہماری اس مشکل کو آسان کر دیا اور نقش کیلئے ایسا حسن کارائہ ویزاں تیار کر دیا جو اپنی سادگی و پرکاری کے لحاظ سے آرٹ کا ایک اچھوتا نمونہ ہے ہم اس لطف عنایت کے لئے صاحب صوف کا تہ دل سے شکر یہ ادا کرتے ہیں! **شکر یہ** نقش کبھی اس حسن اہتمام کے ساتھ شائع نہ ہو سکتا اگر جناب احمد مدین خان صاحب پرنسپل گلہ و رنگ کی دلچسپیاں سکے ساتھ نہیں دراصل نقش ”کا موجودہ حسن و جمال اور رنگ و روپ آپ ہی کے ذوق و توجہ کا نتیجہ ہے اور اس کے لئے ہم صاحب مروج کا جس قدر شکریہ ادا کریں کم ہے

آخر میں ہم اُن بیرونی احباب کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتے جنہوں نے نقش پر نظر التفات فرمائی اور اپنے نقوش جمیل سے اُس کی زینت و آرائش میں کئی گنا اضافہ کر دیا

اختر۔ ایم۔ اے

میرا کلام بہترین

آج کل میرے کلام بہترین کی ہے تلاش
 آپ بتی آپ کو اپنی سنا سکتا میں کاش
 اک طرف فکرِ سخن تھی اک طرف ذکرِ معاش
 اس تضادِ دم سے ہوا تھا شیشہ دلِ پاش پاش
 غمِ شش تک گونجی تھی اُسدِ دم ایک آوازِ حزیں
 تھی یہ آوازِ حزیں

میرا کلام بہترین

میرے دم سے جن دنوں روشن تھی ہر نیم سخن
 شمع کہ کمرِ جلائی تھی مجھے ہر انجمن
 میری بولی بولتے تھے ہم صفیہ ان چمن
 پھر سہ بازار کرتے تھے نمودِ ماؤں من
 مقامِ رے نخلِ مہنہ سے خرمن ہر خوشہ چیں
 خرمن ہر خوشہ چیں
 میرا کلام بہترین

جن دلوں جنس سخن کے بیچنے پر تھا مدار
 میری مزدوری چمکاتے تھے مرے سرمایہ دار
 کوڑیوں میں تولتے تھے جب وہ موتی بار بار
 دید کے قابل ہوا کرتے تھے میرے شاہکار
 خندہ آتما تھا مرے لب پر - مگر اندوگیں
 خندہ اندوگیں
 میرا کلام بہتریں

شعر کی وسعت گزروں سے ناپتے تھے بے شعور
 پھر سیاہی بن کے ڈھلتا تھا مری آنکھوں کا نور
 بعد ازاں ہوتی تھی میری حاضری اُن کے حضور
 سرد مہری دیکھتی تھی بارہا چشمِ غیور
 پانی پانی ہو کے رہ جاتی تھی آہِ آتشیں
 میری آہِ آتشیں
 میرا کلام بہتر ہے

آخر ایسی گرم بازاری سے میں تنگ آ گیا
 اب مرے روئے سخن پر اور ہی رنگ آ گیا
 میرے ہاتھ اک ساز بے آواز و آہنگ آ گیا
 کچھ نہ کہنے۔ سنتے رہنے کا مجھے ڈھنگ آ گیا
 اب اڑائی جا نہیں سکتی یہ طرزِ دلنشیں

ہے یہ طرزِ دلنشیں

میرا کلام بہتر ہے

اب چراغِ اپنا تہ دامن جلا لیتا ہوں میں
 نغمہٴ دل۔ دل ہی دل میں گنگنا لیتا ہوں میں
 جب بھی تنہائی ملے محفلِ جما لیتا ہوں میں
 جھومتا ہوں۔ رقص کر لیتا ہوں۔ گا لیتا ہوں میں
 دل مرا بسا تھ رہتا ہے۔ جہاں میں ہوں۔ وہیں

اب جہاں میں توں وہیں

میرا کلام بہتری

ابوالاثر حفیظ جالندھری

مہاراجہ کشن پرشاد بھاشاد (انجمنی)

سرزمین دکن کی وہ گرانقدر سہی جس نے دکن کی تاریخ میں نہایت شاندار باب کا اضافہ کیا، جس نے اپنے پیچھے اتحاد و یکجہت کی ایک امنٹ تصویر چھوڑی اور جس نے ملک و مالک کی خدمت بجا لاکر ”وفاداری“ کے لفظ کا حقیقی مفہوم سمجھایا۔ بتاریخ ۱۸ شعبان المعظم ۱۲۸۸ھ مطابق ۲۸ جنوری ۱۸۶۶ء بمقام حیدر آباد دنیائے وجود میں آئی۔ آپ کے والد راجہ راجمان راجہ ہری کشن پرشاد بھادڑ کو سلطنت مغلیہ کے نامور تاجدار اکبر اعظم کے وزیر باتدبیر اور نورتن دربار اکبری راجہ ٹوڈرمل کے خاندان سے ہونے کا فخر حاصل ہے۔ نسا آپ کا تعلق آصفی پرچم لہرائے والی سلطنت کے ممتاز خاندان اور مہاراجہ نریندر پرشاد سے ہے۔ آپ کے نانا مہاراجہ نریندر پرشاد کے اولاد نہ تھی اس لئے آپ ہی کو اپنا بیٹا سمجھتے تھے چنانچہ آپ کی پرورش آپ کے نانا ہی کی آغوش شفقت میں ہوئی۔ جب آپ نے کچھ ہوش سنبھالا تو آپ کے شفیق نانا نے گھری پر تعلیم کا انتظام کیا اور اردو۔ فارسی۔ عربی۔ تہذیب۔ گورکھی، سنسکرت اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم مکان ہی پر دلوائی ابتدا چار سال آپ آغا میر لطیف علی صاحب اور آغا میر پرورش علی صاحب کے زیر تعلیم رہے اور بعد میں مرزا علی بابا شیرازی آپ کو درس دینے لگے۔ مولوی سید خلیل صاحب ہراتی آپ کو عربی پڑھایا کرتے تھے۔ اس کے بعد آپ نے مدرسہ عالیہ میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے شرکت کی اور عربی، فارسی، و انگریزی میں کافی استعداد پیدا کر لی۔ آپ ان تمام السنہ پر عبور رکھنے کے علاوہ خوشنویسی اور سپاہیانہ فنون مثل تیراندازی، بوٹ وغیرہ کے بھی ماہر تھے۔ آپ کو شکار کا بہت شوق تھا آپ کی خاندانی وجاہت اور ذاتی قابلیت کی وجہ سے حضرت غفران مکان نے ۱۲۸۸ھ میں راجہ بھادڑ کے خطاب سے سرفراز کیا۔ ۱۳۰۸ھ میں جب سرفقار الامرا بھادڑ شملہ تشریف لے گئے تو آپ نے (۱۳۴۱) دن تک منصرمانہ مدارالہما کی خدمت انجام دی۔ ۱۳۰۸ھ میں آپ کے نانا کا انتقال ہوا۔ چونکہ ان کے کوئی اولاد نہ تھی اور مہاراجہ بھادڑ ہی کو وہ اپنا بیٹا سمجھتے تھے اس لئے مہاراجہ بھائی اپنے نانا کا قائم مقام ہوئے اور ان کی کل جائیداد پر قابض و متصرف رہے۔ ۱۳۱۸ھ میں آپ کو اپنی موروثی خدمت پیشکاری عطا ہوئی اور ساتھ ہی وزارت فوج کے منصب جلیلہ پر فائز کر کے عزت افزائی کی گئی۔ اسی سال آپ کو راجہ راجا مان مہاراجہ بھائی

خود اپنا کلام اشاعت کے لئے مرحمت فرمایا کرتے تھے۔ آپ کا دربار ہمیشہ اہل کمال، علماء، فضلا اور شعراء سے بھرا رہتا تھا بعض شاعروں کو تو آپ مستقل طور پر تنخواہ دیتے تھے۔ مہینہ میں ایک بار پابندی کے ساتھ ایک مشاعرہ مقرر فرمایا کرتے جس میں کثیر تعداد میں شعراء مدعو کئے جاتے تھے۔ اس طرح آپ کی دولت کا کثیر حصہ ذی علم اشخاص اور شاعروں کی سرپرستی اور اعانت میں صرف ہو جایا کرتا تھا۔

آپ کی طبیعت ابتدا ہی سے شعر گوئی کی طرف مائل تھی جس کی وجہ سے آپ تعلیم سے فراغت سے پیشتر ہی شعر و سوز لکھا کرتے تھے۔ آپ کا تخلص شاد تھا۔ شروع ہی سے آپ کے کلام میں تصوف کا رنگ نمایاں طور پر چمک رہا تھا مگر جب آپ نے نانائے شاگردی حضرت غفران مکاں کے سامنے لکھا تو آپ کے کلام میں چار چاند لگ گئے۔ اس سے قبل آپ نے بجو لال ٹکین سے اصلاح لیا کرتے تھے اور اس کے بعد آپ دیگر اساتذہ فن سے مستفید ہوتے رہے۔ حضرت غفران مکاں سے ”شاگرد خاص“ کا لقب پایا۔ اب تک آپ کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ کلام کے مطالعہ سے یہ چلتا ہے کہ آپ کو لغت کہنے کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ آپ کا ایک قصیدہ مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے پیچھے تھانہ شیخ الاسلام کی ایک دیوار پر آویزاں ہے۔ آپ کے کلام کا خاص رنگ تصوف، فقر و فقیری اور عشق حقیقی ہے۔ آپ نے تمام شاعروں کی طرح عاشقانہ اشعار بھی کہے ہیں۔

آسمان پر گر کر برق نگاہ تند یار	ابر میں رہ جائے چھپکر ان کے ڈر سے آفتاب
اُس کی جھوٹی شراب ہے واعظ	تم نہ سمجھو اگر حرام تو لو
گرچہ نہ ہری ہے مار زلف سیاہ	موبو شانہ ہے وبال اس کا
ایک بوسے کی طلب پر بخل یہ	حاکموں کا دل تو دریا چاہئے
لیکن آپ کے کلام کی حقیقی شان تصوف اور عشق حقیقی میں نظر آتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔	
مومن جو نہیں ہوں تو میں کا فر بھی نہیں شاد	اس رنر سے آگاہ ہیں سلطان مدینہ
احد اور احمد ہے کس طرح واحد	وہی جانتا ہے جو سمجھا ہوا ہے
ہوں فنا ذات میں اللہ کے مجھ پرستے	ذکرِ ماکانِ محمد کی صدا آتی ہے
کفر چھوڑا پی کے مے توحید کی	رنگِ شاد اب عاشقانہ ہو گیا

غرض آپ کا کلام مے توحید میں ڈوبا ہوا اور نشہ تصوف سے بھرا ہوا ہے۔

مذہب کے متعلق آپ کا عقیدہ تھا کہ دُنیا کے تمام مذاہب کا مقصد ایک ہے۔ کسی مذہب کی کوئی خصوصیت اس کی پیشانی پر لکھی نہیں ہوتی بلکہ تمام انسان اخلاق اور تہذیب و تمدن کی ضرورتوں میں برابر کے شریک ہیں مسجد

مندرجہ ذیل کلبیا اور گرو دوارے بلا کسی تفریق کے مساوی طور پر قابل احترام ہیں کیونکہ ان سب جگہ اسی ذاتِ وحدہ لاشریک کی عبادت کی جاتی ہے جس کا نور ہر بے ریا دل کو روشن کرتا رہتا ہے۔ کہنے والے آپ کو ہندو کہتے ہیں۔ مگر حق میں اور حق شناس نظروں سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ نہ ہندو تھے اور نہ مسلمان۔ عیسائی تھے نہ پارسی آپ مذہب کی ان تمام زنجیروں کی قیود سے آزاد تھے اور شہِ وحدت سے سرشار تھے ۵

مشرپ عشق اور ہی نہیں ہے تو نہیں اس کو جانتا واعظ
شاد ہے مستِ بادہ تو حید تو سمجھتا ہے اس کو کیا واعظ
آپ کبھی بھی ہندو مسلمان کی باہمی افراتفری میں نہیں پڑے ہر وقت اور ہر جگہ حتیٰ کہ خود اپنی تصنیفات میں ارشاد فرمایا ہے کہ ۵

کافر نہ کہو شاد کو ہے عارف و صوفی شیدا ہے محمدؐ ہے وہ شیدا ہے مدینہ
غرض آپ مذہب کی ان تمام قیود کو ٹوٹ چکے تھے جو راہِ عشق میں حارج ہوتی ہیں۔ شاید اب مہاراجہ ہسار کی زبان سے نکل رہا ہوگا ۵

چشمِ وحدت سے دیکھتا ہوں صبر نظر آتا ہے تو ہی تو مجھ کو
مہاراجہ بہادر خوش اخلاق اور مروت میں اپنی نظیر آپ تھے۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ ضرور عوام کے لئے دربار کرتے جس میں ہر قسم کے لوگ بلا کسی روک ٹوک کے شریک ہو سکتے تھے ان سے آپ نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتے اور حتیٰ الامکان ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ آپ شاہانِ دیشانِ آصفیہ کے سایہ میں پلے اور بڑھے۔ اس لئے آپ کی لگ رگ میں جوش و فدا داری اور اپنے بادشاہ کی خدمت کا مادہ بھرا ہوا تھا۔ اپنے ملک اور بادشاہ کے لئے تن، من، دھن اور ہر چیز کی قربانی کو خوش بختی پر معمول کرتے تھے۔ آپ چند امرائے سلطنت میں سے تھے جو ملک اور قوم کی آنکھوں کا تارہ ہوتے ہیں۔ آپ کی ایک خاص خصوصیت زمانہ موجودہ میں مشرقی آداب و رسوم کی دلدادگی تھی۔ داد و دہش میں آپ کیتائے زمانہ تھے۔

جب کبھی آپ گھر سے باہر نکلتے روپیوں، پیسوں کی پھیلیاں ساتھ رکھتے اور غریبوں کی صدا پر کہ ”بچے والے راجہ پھینک“ آپ جو کچھ ہاتھ آتا ان پھیلیوں سے نکال باہر پھینکتے جاتے۔

گذشتہ ماہ تیرہ مارے لئے تیرے کچھ کم نہ تھا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ۸ تیر ۱۳۷۹ء کی صبح ہمارے لئے نہایت روح فرسا اور اندوہناک پیام ملائے گی۔ اور ہم سے ہماری نہایت ہی عزیز متاع چھین لی جائے گی۔ نہ جانے اس دن ہم میں سے کتنوں کی خوشیاں غم سے بدل گئی ہوں گی اور کتنوں کے غم کی آگ ابھی تیز تر ہو گئی۔ آہ! کتنا غم آگیاں وقت تھا جبکہ

”شاد مینش“ ماتم کردہ بن گیا۔ وفا اور صدق، بہمدی اور غم خوردی بنی نوع انسان کی حیثی جاگتی تصویر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ واقعی سچ ہے کہ کل نفس ذا ثقتہ الموت دہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ اس وقت مہاراجہ کی عمر ۸۶ سال سے کچھ دن اوپر تھی۔ بندگان عالی کا یہ ارشاد کہ ”پُرانی بساط کا آخری مہر اٹھ گیا، کتنی صداقت پر مبنی ہے۔ مہاراجہ کی عظمت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ حضور پرنور نے آپ کی نعش پر ارشاد فرمایا کہ ”سر مہاراجہ کی ملک و مالک سے وفاداری مسلم تھی۔ قدیم آداب و وضع کا مجسمہ اور اپنے وقت کے قابل قدر انسان تھے۔“ اسکے بعد بندگان عالی نے بنفس نفیس سر اکبر حیدری کو حکم دیا کہ مہاراجہ کی آخری رسومات اُن کے خاندانی رواج کے مطابق عمل میں لائی جائیں۔

یوں تو دنیا میں بھی چیزیں فنا ہوتی ہیں۔ انسان پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں۔ بعض بد بخت ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی موت دنیا کے لئے باعثِ نجات ہوتی ہے۔ بعض افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی وفات سے لوگ بالکل غمناک رہتے ہیں۔ لیکن چند ہی ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں جن کے دنیا سے اٹھ جانے سے ساری خلقِ خدا مصروف الم ہوجاتی ہے مہاراجہ بہادر کا شمار ایسی ہی چند ہستیوں میں ہے۔ دکن کا وہ کونسا شخص ہے جو آپ کی ذات گرامی سے واقف نہیں اور جس نے آپ کی وفات پر اظہارِ تاسف نہ کیا ہو۔ غریبوں میں ”بچے والے راجہ“ امیروں میں ”امیر مزید“ شاعروں میں ”سخن فہم شاد“ غرض یہ کہ ہر طبقہ میں مقبول۔ آپ دنیا سے اٹھ گئے لیکن آپ کا نام باقی ہے جس کو نہ کوئی آگ جلا سکتی ہے اور نہ زمانے کے حادثات مٹا سکتے ہیں۔

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

شیخ افضل محمد
متعلم سال دوم۔ ونگل کالج

مغنیہ

ابھی اوسین مغنیہ یونی گائے جا یونی گائے جا!

ہے سکون طلب غم زندگی، غم زندگی کو مٹائے جا! جو نظر بہ ہوش و خرد کے پردے پر نہیں اٹھائے جا!
تو فضا کی وسعت بیکراں پہ شرابِ نغمہ بہائے جا! یہ نشاط و حسن کی داستانِ حجاز ہے، سناے جا!

ابھی اوسین مغنیہ یونی گائے جا یونی گائے جا!

ترے نغمائے سرور میں کبھی لذتیں ہیں شراب کی کبھی سحر کاری حُسن ہے کبھی نغمہ شیں ہیں شراب کی
کبھی غم نوازی عشق ہے کبھی کیفیات ہیں شراب کی کبھی رنج و کوشش ستر میں ہے مے جہانِ خراب کی

ابھی اوسین مغنیہ یونی گائے جا یونی گائے جا!

ابھی مجھ کو اپنی خبر ہے میں طیسمِ ہوش مٹاؤ دوں جو کسک ہے درد کی دل میں اُس کو نوائے نغمہ کھاؤ دوں
جو مشاہداتِ نظر ہیں خوابِ خیال اُن کو بناؤ دوں میں خودی اور خودی کی ساری حقیقتوں کو بھلاؤ دوں

ابھی اوسین مغنیہ یونی گائے جا یونی گائے جا!

مری روح تشنہ ساز ہے ابھی اُس کی پیاس بجھ نہیں جو قصورات نہ پاسکیں وہ نشاطِ زیست ملی نہیں
جو بے بصورتِ اشک مجھ کو نصیب ایسی خوشی نہیں مے دل کی سر دکشافتوں میں لطیفِ خندہ زنی نہیں

ابھی اوسین مغنیہ یونی گائے جا یونی گائے جا!

صمد رضوی ساز۔ بی۔ اے ایل ایل بی قدیم طالب علم ونگل کالج

اُردو کے جدید مختصر قصوں دوسری زبانوں کے اثرات

اس مختصر سے مضمون میں میں نے ایک محدود کوشش کی ہے کہ اُردو کے مختصر قصے کو متاثر کرنے والی مشہور زبانوں کے اثرات لگائے جائیں۔ یہ مضمون چونکہ ایک حیثیت سے بے سرو سامانی میں لکھا گیا ہے اس لئے بہت ممکن ہے اُردو کی اس صنف کے ماہرین کو اس میں خامیاں نظر آئیں۔ بہ صورت اس کا اعتراف ضروری ہے کہ میرا یہ مضمون تحقیقی نہیں ہے۔

اس تیز روزانے کی مصروفیتیں ہمیں طویل ناول کے مطالعے کی اجازت نہیں دیتیں۔ انسانی فہمیت کا رجحان اختصار کی طرف مائل ہے اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر زبان کے ادب میں مقبولیت کا تاج صرف اسی صنف کے سر پر رکھا ہے۔ اُردو زبان ابتدا سے خوش قیمت رہی ہے، جس میدان میں اس نے قدم رکھا وہ اُسے پہلے ہی سے صاف کیا ہوا ملا اس کے علاوہ اس کی اقبال مندی کے کچھ اندرونی اسباب بھی ہیں۔ سب سے بڑی وجہ اس کی اکتسابی قابلیت ہے۔ اس خصوصیت کی وجہ سے اس نے دنیا کی ہر بڑی زبان اور ہر صنفِ ادب سے استفادہ کیا ہے۔ اُردو مختصر قصے پر دوسری زبانوں کے اثرات کا اجمالی طور پر ذکر کرنے سے پیشتر سہولت کی خاطر ہم ان زبانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر لیں گے۔ ایک حصہ کو ہندوستانی زبانوں سے موسوم کریں گے اور دوسرا حصہ غیر ہندوستانی زبانیں کہلائیں گے۔ ہندوستانی زبانیں :-

ممکن ہے اس خصوص میں ہندوستان کی بہت سی زبانوں نے اُردو کو متاثر کیا ہو لیکن ان میں بہت زیادہ نمایاں ہندی اور بنگالی رہی ہیں۔

۱۔ ہندی۔ ہندی کی خصوصیت جو اُسے ہندوستان کی دوسری زبانوں سے ممتاز کرتی ہے، اس کا ترجمہ اور لوچ ہے

چنانچہ اُردو نے بھی اس کی اس دل لٹھا لینے والی خصوصیت سے استفادہ کیا۔ ہندی میں جدید قصبے اُن ہی اثرات کے تحت لکھے گئے جن کے تحت اُردو مختصر قصبہ نویسی نے رنگ بدلے ہیں لیکن دونوں زبانوں کا اثر قبول کرنے کی قابلیتیں یہ فرق تھا۔ اس لئے جب ہندی کی خصوصیت نے پائیداری حاصل کی تو وہ اس قابل ہوئی کہ اُردو کو متاثر کر سکے۔ اس کی وجہ سے ہندی کے چند میٹھے اور سادہ الفاظ جو اس سے پہلے اُردو میں عام طور پر مستعمل نہ تھے۔ تحریر میں استعمال ہونے لگے جیسے لیدان، اچھا، اُپائے، کارن، پریم، پریم، پریم، پریت، امورکھ، شکتی، شاننی، سندرو وغیرہ۔ لیکن اس سے زیادہ قابل ذکر اثر ہندوؤں کی معاشرت اور عقائد کے اُن خاص پہلوؤں سے اُردو دواؤں کو روشناس کرانا تھا جو اس سے پہلے نہ ہوئے تھے۔ دوسری زبانوں کی طرح اُردو میں صنمیت کا جز زیادہ نہ تھا۔ انگریزی اثر سے کیو پڈ مانوس ہوتا تھا لیکن اسی قبیل کے اور دوسرے ”ارباب“ اُردو میں ابھی داخل نہ ہوئے تھے۔ لیکن ہندی کے اثر کے تحت ہندو دیومالا کے مشہور کردار اُردو میں عام طور پر اُن غیر لمسی چیزوں کے لئے استعمال ہونے لگے جو اُن ”ارباب“ سے متعلق ہیں۔ جیسے ”سرسوتی“ علم کے لئے، ”کالی“ موت کے لئے، ”لکشمی“ دولت، اور ”کام دیوتا“ محبت کے لئے فلمی قصوں اور افسانوں کو اس ترویج میں بڑا دخل حاصل ہے۔

ہندوستان کے مشہور ادیب منشی پریم چند کی وجہ سے اُردو کے مختصر قصوں پر ہندی کے قصوں کا کافی اثر پڑا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے آخری زمانے میں اُردو کے بجائے ہندی میں لکھنے لگے تھے بعد میں اسی قصبے کو اُردو کا جامہ پہنا دیتے تھے۔ وہ بھی اس طرح کہ لباس کے طرز میں ہندیت نمایاں طور پر جھلکتی تھی۔ ہندو معاشرت کے وہ مسائل جن سے عام طور پر اُردو میں بحث نہ کی جاتی تھی۔ ان ہی کے نصف مترجمہ قسم کے قصوں کی وجہ سے اُردو میں تحریر کئے جانے لگے مسئلہ تناسخ ہندوؤں کا ایک خالص مذہبی مسئلہ ہے لیکن اس پر قصبے کے پلاٹ کی مبنیاد رکھنے کی وجہ سے یہ ادب میں بھی گیا موجودہ زمانے کے ہندو معاشرتی مسائل جیسے بچپن کی شادی، بیواؤں کی شادی، حق طلاق، چھوٹ چھات وغیرہ اُردو کے اکثر جدید افسانوں اور قصوں کی مبنیاد ہوتے ہیں، گو محبت ان سب قصوں کا جز لا ینفک رہتی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی عورت کی وفا اور شوہر پرستی کی مخصوص ذہنیت کو اُردو میں صرف ہندی کے اثر سے عمومیت حاصل ہوئی۔

۲۔ بنگالی۔ ہندوستانی زبانوں میں دوسری قابل ذکر زبان جس نے اُردو پر اثر ڈالا ہے بنگالی ہے۔ بنگالی یا بنگلہ بذات خود ایک ترقی یافتہ زبان ہے۔ اس کا اعتراف یہاں ضروری ہے کہ بنگال کے اُردو دہو نے اور سمجھنے والوں نے اُردو میں بنگالی ادب کے دیکتے پاروں کو روشناس نہیں کرایا۔ بنگال نے اُردو کے بہت زیادہ محسن پیدا نہیں کئے قاضی نذیر اللہ اسلام

کے علاوہ جدید افسانہ نگاروں میں کافی شہرت کی مالک بنگال کی ایک خاتون طاہرہ دیوی بھی ہیں لیکن ان کے افسانے یا قصے یا تو طبعِ ادبی یا پھر مغربی زبانوں سے ان خود یا ترجمہ کئے ہوئے۔ یہ ترجمہیں اصل کی خوبیاں باقی رکھتی ہیں، اتنی کہ موپساں کے ایک افسانے کے ترجمے ”خواب رنگیں“ کے متعلق مرحوم منصور احمد نے لکھا تھا ”اگر آج موپساں زندہ ہوتا تو یہ فیصلہ نہ کر سکتا کہ ترجمہ کونسا ہے اور اصل کونسا“

بہر حال یہ بنگالی شہکاروں کی شہرت تھی جس نے اردو دانوں کی توجہ کو اپنی طرف منطف کیا اور اس طرح اردو نے بنگالی سے معمولی سا ہی سہی استفادہ کیا ہے ”کسی قوم کا ادب اس کی تہذیب و تمدن کا آئینہ ہوتا ہے“ کی روشن ترین مثالوں میں بنگالی ادب کو جگہ ملنی چاہئے۔ بنگالیوں کی رومان اور جرأت سے بھری ہوئی ذہنیت اور زندگی کا آئینہ بنگالی ادب ہے اور اس ادب کے اسی مخصوص حصہ نے اردو پر انڈالا۔ اردو میں جذباتی قسم کے پلاٹ رکھنے والے قصے عموماً بنگالی سے کسی نہ کسی حد تک ضرور متاثر رہتے ہیں۔ ہندوستان کے مقبول فلمی قصے جو اردو کے بہت سے مختصر قصوں کی پیدائش کا باعث ہوئے، عام طور پر بنگالی ہی ہیں۔

بنگال کے عظیم ترین شاعر، ٹیگور جو اچھے ادیب بھی ہیں اور عالمی شہرت کے مالک بھی۔ اردو میں ترجمہ کے لئے مقبول ہیں۔ ان کی اکثر و بیشتر کتابیں اردو میں منتقل کی جا چکی ہیں جنہوں نے اسپر اپنا ایک پائدار اثر چھوڑا ہے، روحانیت، فلسفہ، اخلاق، مظاہر قدرت اور موسیقی سے دلچسپی اس اثر کے نمایاں جز ہیں۔

غیر ہندوستانی زبانیں :-

سہولت کی خاطر ہم اس حصہ کو اردو شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) مشرقی (۲) مغربی

(۱) مشرقی :-

۳۔ جاپانی۔ اردو جاپانی سے حال ہی میں واقف ہوئی ہے اور دلچسپی سے اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اسکی اس دلچسپی کی توجیہ (غیر سنجیدہ طور پر) یوں کی جاسکتی ہے کہ اردو ہندوستان کی عام زبان ہے، ہندوستان بدمہمت کا جنم بھوم اور جاپانی ادب بدمہمت کا آئینہ دار۔ اس طرح اردو کی جاپانی سے دلچسپی قرینے کے مطابق ہے۔

جاپانی تک ہماری رسائی ابھی ابھی ہوئی ہے۔ اب تک ہمیں دوسری زبانوں کا واسطہ اختیار کرنا پڑا تھا، چنانچہ اردو میں بہت سے ایسے انگریزی افسانوں کا ترجمہ کیا جا چکا ہے جو جاپانی سے ماخوذ تھے۔

جاپانی ادب کو اردو سے راست روشناس کرائے والوں میں سب سے پہلے پروفیسر برلاس اور مسٹر برلاس کا نام لیا جانا چاہئے۔ یہ دونوں پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے جاپانی ادب سے دلچسپی کو اپنی زبان کی خدمت کا ذریعہ بنایا ہمایوں اور ساتی نے جاپانی ادب کے شہکاروں کے تراجم شائع کئے۔ ساتی نے تو جاپانی ادب نمبر بھی شائع کیا۔ یہ ایک

مستحسن اقدام تھا۔ اب بہت سے جاپانی پروفیسر اور ادیب۔ اُردو کے لئے خاص طور پر مضامین لکھتے ہیں جن کے ترجمے جاپان میں مقیم ہندوستانی اصحاب اُردو رسالوں میں بھجواتے ہیں۔ ان ہی ذرائع سے ہمیں معلوم ہوا کہ سکورا جاپان کا خاص پھل ہے۔ موسم بہار کا پھلادن وہاں کی قومی عید اور اپنے مژدوں کا احترام ان کا خاص عقیدہ -

جاپانیوں کی خاموش محنت، بادشاہ پرستی، وطنیت اور پھولوں سے محبت وہ خاص موضوع ہیں جو اُردو میں جاپانی ادب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انگریزی کے توسط سے ترجمہ کئے ہوئے جاپانی افسانوں کے ذریعہ جاپانیوں کے انشعافی جذبہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ترجموں کے علاوہ اُردو میں جاپانی طرز کے دو چار طبعزاد قصے بھی لکھے جا چکے ہیں۔ 'بھانامتی' ایک ایسا ہی قصہ ہے جس کے کردار ہندوستانی ہیں لیکن جذبہ انتقام جاپانی، ذریعہ انتقام بھانامتی (ہندوستانی جادو) ہے لیکن جائے وقوع جاپانی بدھ مت والوں کا ایک پُرانا مندر۔

۴۔ چینی جاپانی کے سلسلہ میں چینی زبان کا بھی ذکر آ جاتا ہے لیکن اُردو میں اس کی کوئی مستقل نمائندگی نہیں ہوئی کبھی کبھی کوئی ماخوذ قصہ یا ترجمہ نظر آ جاتا ہے۔ چین کے چند پُرانے تاریخی قصوں کو، وہ بھی شاید دوسری زبانوں کے توسط سے اُردو وایا گیا ہے۔ اُردو اس زبان سے ابھی اتنی متاثر نہیں ہوئی ہے کہ اس قسم کے تذکرے میں اُسے کوئی مستقل جگہ مل سکے۔ ۵۔ ترکی اسی شعبہ میں ترکی زبان کا... ذکر کر دینا بھی ضروری ہے۔ سجاد حیدر یلدرم نے خاص طور پر ترکی ہی کو ترجمہ کے لئے انتخاب کیا۔ لیکن اس زبان نے اُردو کو مختصر قصے پر اپنا کوئی نمایاں اثر نہیں چھوڑا ہے۔ ترکی سے متعلق اُردو میں بہت سے ناول، افسانے اور قصے ملتے ہیں لیکن وہ ترکی ادب سے نہیں بلکہ ترکی تاریخ سے متعلق ہیں۔ اس طرز میں یلدرم کے علاوہ شاید ہی کسی اور نے قصہ نویسی کی کوشش کی ہو۔ خود یلدرم کو ترکی کی تمام خصوصیات کے بقا کے ساتھ ترجمہ کرنے میں بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ وہ اس میں ایک حد تک کامیاب تو رہے لیکن ان کا اسلوب بیان ناقابل تقلید ہو گیا گو زبان لطیف اور دلکش رہی۔

(۷۶) عربی و فارسی جدید اُردو کی اس صنف پر ان زبانوں کا بہت ہی کم اثر ہے ناقابل محسوس سا۔ گو اس کا اعتراف ضروری ہے کہ کبھی کبھی ان زبانوں سے خصوصاً عربی جدید کے کسی افسانے کا ترجمہ کر لیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید عربی اور جدید فارسی خود مغربی زبانوں سے اسی طرح متاثر ہیں جس طرح اُردو ہے

اس سے قطع نظر اُردو کی نثر اور اس وسیع میدان کے مختلف شعبہ قدیم عربی و فارسی کے ابتداء سے رہیں منت ہیں خود قرآن مقدس میں مختلف قسم سے موجود ہیں۔ ان کے علاوہ انبیاء اولیاء اور دوسرے مقدس لوگوں کے حالات زندگی مختلف مغفور و مغضوب قوموں کے متعلق معلومات، خدا کے مشہور نافرمانوں کے حالات، خاص خاص واقعات اور

پھر مختلف ادبی قصبے بمقامات لطیف، بادشاہوں اور خلفاء کے درباری واقعات - جانوروں کی زبان سے کہے ہوئے قصبے - ایرانی شاہ نامے وغیرہ یہ سب ان ہی زبانوں سے اخذ و ترجمہ کئے گئے ہیں۔ ان سب کے علاوہ تاریخ اسلام ایک بحرِ ناپیدا کنارہ ہے جس کی جزئیات نے ہزاروں قصوں کو جنم دیا ہے اور تاریخ اسلام کا مأخذ و سرچشمہ عربی و فارسی ہی ہیں۔ یہی زبانیں اردو زبان اور اس کی بہت سی اصنافِ ادب کا سرمایہٴ حیات ہیں۔ اس عظیم الشان موضوع کو چھیٹنے کی کوشش خصوصاً اس مختصر مضمون میں بیجا جرأت ہوگی۔

(۲) مغربی :-

۸۔ فرانسیسی اردو پر فرانسیسی کا اثر دو طرح پڑا ہے، بالواسطہ اور بلاواسطہ۔ واسطہ کا سہم اس وقت کتابِ حوصلہ مند لوگوں نے فرانسیسی نثر کی کوشش کی، اس میں کامیاب ہوئے اور بہت سے شہ کاروں کو اردو کا جامہ پہنایا۔ اردو پر نمایاں اثر انقلابِ فرانس کے پیدا کردہ ادب کا ہوا۔ اس عہد کے بہت سے ادیب اردو میں مقبول ہوئے لیکن خصوصیت 'کٹر ہیرو' اور اس کے پیش رو 'روسو' جیسے یگانہ روزگار ادیبوں کو حاصل ہوئی۔

فرانسیسی ادب کی ایک خصوصیت زبان کی سلاست و پاکیزگی بھی ہے جس نے اردو پر اپنا نمایاں اثر چھوڑا ہے فرانسیسی ادیب زبان پر قدرت کا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کا تفصیل سے مطالعہ کیا ہے۔ جہاں وہ شہِ عشرت کی محفلوں کا سماں الفاظ میں کھینچ سکتے ہیں وہاں غریب طبقہ والوں کے مچھلے ہوئے دلوں کے بھڑکنے جذبات کی بھی سچی ترجمانی کر سکتے ہیں۔ انقلابِ فرانس کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو جب تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے تو پورا انقلاب اجمالی حیثیت سے پیش نظر ہو جاتا ہے۔

حسن و عشق اور دوسرے اس قبیل کے انسانی جذبات سے بحث کرنے والے موضوعات دنیا کی ہر زبان و ادب کا جز ہیں لیکن پیش کرنے کا طریقہ ہر ایک میں کچھ نہ کچھ مختلف ہوتا ہے۔ فرانسیسی ادب کا اثر موضوع یا مضمون سے زیادہ زبان پر ہوتا ہے۔ اس کی نثر میں بھی ایک ترنم ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی زبان زندگی کے حادثاتی، خطرناک اور بھیاںک پہلوؤں کے لئے عموماً مناسب نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے ادب کے سنسنی خیز جز میں فرانسیسی کو شاید ہی کوئی اضافہ کرنا چاہئے تھا لیکن انقلابِ فرانس نے جو ادب پیدا کیا وہ اسکے برخلاف اثر کرتا ہے۔

فرانسیسی ادیبوں میں سے چند جن کے افسانوں اور قصوں کے ترجمے اردو میں کئے گئے اور جنہوں نے اردو ادب میں قبولیت حاصل کی یہ ہیں ژولان، بلزاک، موبساں وغیرہ۔

یہاں اس اثر کا بھی تذکرہ ضروری ہے جو فرانسیسی سے ہم نے بالواسطہ حاصل کیا ہے۔ ہندوستان میں مغرب کی نمائندگی انگریزوں نے کی ہے اور انگریزی نے مغربی زبانوں کی۔ چنانچہ فرانسیسی ادب کا اثر بھی پہلے پہل انگریزی ہی کے ذریعہ سے پڑا۔ یہاں اس صراحت کی ضرورت نہیں کہ خود انگریزی زبان و ادب کے لئے فرانسیسی کی بہت کچھ مرہونِ منت ہے۔ اس طرح انگریزی جب کسی زبان پر اثر انداز ہوتی ہے تو اپنے واسطے سے اس زبان تک فرانسیسی کا اثر بھی پہنچا دیتی ہے۔ یہاں اس کا اظہار ضروری ہے کہ اُردو نے بعض دفعہ بڑی کامیابی سے فرانسیسی کے اصلی رنگ کو اپنے میں منتقل کیا ہے گو انگریزی نے اس کی روح کو گننا دیا تھا مثال کے طور پر وکٹر ہیوگو کے ناول *La Misérable* کا اُردو ترجمہ ”بد نصیب“ پیش کیا جاسکتا ہے۔

بہت سے فرانسیسی کرداروں سے ہم اتنے مانوس ہو چکے ہیں کہ ہم انہیں بعض وقت اپنے ہی میں سے سمجھنے لگتے ہیں جس طرح فردوسی نے شاہ نامے کے کرداروں کو ہم سے مانوس کر دیا ہے اور اب ہم رستم کو اپنا پہلوان، جمشید دارا اور فریدوں کو اپنے بادشاہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح فرانسیسی ادب نے ہمیں نپولین سے مانوس کر دیا ہے۔ اگر ہم کما جائے کہ کسی بہادر سپہ سالار یا بادشاہ کا نام لیں تو جس طرح ہم رستم کے مقابلے میں ہمیشہ کو بھول جاتے ہیں اسی طرح اس وقت ہمیں نپولین کے مقابلے میں ملک کا ذریعہ یا رانا پر تاب سنگھ کے نام یاد نہیں آتے۔ آج نپولین ایسا ہی ہمارا ہے جیسا مقدونیہ کا سکندر۔

انقلابِ فرانس اور نپولین کے کارناموں کے موضوعات پر لکھے ہوئے اُردو افسانوں اور قصوں کو جمع کیا جائے تو ان کی تعداد کافی زیادہ ہو جائے گی جو اس قابل ہے کہ جب کبھی اُردو ادب پر یورپی زبانوں کے اثرات کا تذکرہ کیا جائے تو اس میں اُسے نمایاں جگہ حاصل ہو۔

فرانسیسی سے ہماری دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ ساقی اور بہاؤں نے فرانسیسی ادب نمبر نکالے اور اُن میں فرانسیسی کے مقبول شاہ کاروں کے ترجمے شائع کئے ہیں۔ یہ اُردو کی خوش بختی کی نشانی ہے۔ لیکن فرانسیسی کا میدان نہایت وسیع ہے ہم نے اس سے جو کچھ سیکھا ہے وہ اس کے مقابل میں جتنا ہم اس سے حاصل کر سکتے ہیں کچھ بھی نہیں ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ نہ صرف عشقِ شاہ کاروں سے استفادہ کیا جائے بلکہ فرانسیسی ادب کے دورِ جدید خصوصاً جنگِ عظیم کے بعد کے ادب سے بھی اثر پذیر ہوں۔ ہماری گونا گونی ہماری ہمہ گیریت کا باعث ہوگی۔

۹۔ روسی روسی ادب خصوصاً جدید روسی ادب بہت کم سن ہے لیکن سب سے زیادہ متاثر کن بھی ہے۔ انیسویں صدی عیسوی سے اس کی ابتدا ہوئی ہے لیکن اتنے تھوٹے عرصے میں اس نے جو ترقی کی وہ اس کی عظمت کی دلیل ہے۔ یہ ادب انقلابِ حریت پسندی، غریبوں کی ہمدردی اور قدرت کی مفصل عکاسی کا رقعہ ہے۔ اس ادب کی خصوصیت یہ ہے کہ

اس کی تمام صنفوں میں سب سے زیادہ اہمیت مختصر قصوں کو حاصل ہے۔ اس کا مشہور ترین ادیب میکسم گورکی افسانہ نگاری تھا۔ روسی ادب نے اتنی مختصر مدت میں اپنے ادیبوں کو وہ شہرت دی ہے جو زمانہ دوسری زبانوں کے ادیبوں کو صدیوں میں دے سکا۔ ٹالسٹائی اور میکسم گورکی اپنی جگہ روس اور وکٹر ہیگو، ٹیکسپیر اور ملٹن، شکر اور گوٹے کی صف میں رکھتے ہیں روسی ادب کے مشہور مصنف ٹالسٹائی، واسٹووسکی، چیخوف، آئیڈرلیف، گارشن، تورگنیف، گوگل، پشکن اور گوگی ہیں۔ ہر ایک روسی ادب کی خصوصیت کو مشترک رکھتے ہوئے بھی انفرادیت کے خاص رنگ کا حامل ہے۔ ان میں سے ٹالسٹائی اور گورکی نے بین الاقوامی شہرت اور قبولیت حاصل کی۔

ٹالسٹائی دُنیا کے مشہور ادیبوں میں سے ہے۔ اس کی عظمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے برصغیر اور گرانما یہ مفکر کی اکثر کتابیں مہذب دُنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ یہی وہ ہستی تھی جس نے زار کی باجروت شخصی حکومت کے ہوتے ہوئے اس وقت حریت و آزادی کا علم بلند کیا جب اہل روس نے غلامی ہی کو مدارِ حیات تصور کر کے حکمران کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیا تھا۔ لیکن اس کی آواز کمزور تھی۔ اس کے مخصوص خیالات اور عقاید پسند کئے گئے لیکن صرف واجب التعظیم ہی رہے واجب التعمیل نہ بن سکے۔ اس کا مشہور عالم ناول ”ایٹا کرینینا“ کا فلمی قصہ اُردو میں منتقل ہو چکا ہے۔ اس کی بہت سی کتابیں جیسے ”جنگ اور امن“، ”حیات بعد الموت“ *Resurrection* ”زبردستی ظلمات“ *Power of Darkness* اُردو کا لباس پہن چکی ہیں اور یہ لباس انہیں کچھ بیگانہ بھی نہیں لگتا۔

میکسم گورکی روس کا وہ فقیہ المثل ادیب ہے جسے زمانہ صدیوں میں پیدا کرتا ہے۔ روسی انقلاب میں اس شخص کے قلم نے جتنا کام کیا ہے اتنا شاید ہی کسی اور ہستی نے کسی ذریعہ سے کیا ہو۔ اس کی خصوصیات اور ادبی قابلیتوں کے مختصر سے تذکرے کے لئے ہمایوں اور عالمگیر کو اپنے روسی ادب نمبر دوبارہ شائع کرنے پڑینگے۔ ۱۹۵۵ء میں اس نے پہلا افسانہ *Maker Chay* لکھا۔ اس کے بعد سے افسانوں اور قصوں کی ایک بڑی تعداد کو اس کے قلم نے حیاتِ جاوید بخشی لیکن ان سب سے زیادہ متور و درخشاں ”ماتا“ ہے۔ گورکی ایک بے باک مفکر تھا جس نے اپنی جوانی ہی میں دُنیا کی تلخ کامیوں کا کافی تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ اس کو بعض صلاحیتیں قدرت سے ودیعت ہوئی تھیں جن میں سادہ بیانی اور صاف گوئی کو نمایاں جگہ ملنی چاہیے۔ ”فطرت کی نقاشی“، ”رومان کی چاشنی“، ”حقیقت نگاری“، ”پائین طبقہ کا انتخاب“، ”توت لینا“ اس کی خصوصیات کی چند نمونہ خیاں ہو سکتی ہیں جن پر کتابیں تصنیف کی جاسکتی ہیں اور شاید پھر بھی یہ گورکی کی تمام خصوصیات کو اچھی طرح اجاگر نہ کر سکیں۔

”وہ صرف اس لئے اپنا قلم اٹھاتا تھا کہ اُسے گوشِ انسانیت تک کچھ پہنچانا مقصود ہوتا تھا۔ اس کے مضطرب ربطِ فکر

میں پر دہ سبیں پہ دکھلائی جا رہی ہوں۔ ان تصاویر میں ہم رگوں میں دوڑتا ہوا خون، حرکت کرتی ہوئی نسیں اور پراسرار نظام عصبی کا جو اس سے پیشتر ہماری آنکھوں سے نہاں تھے، بخوبی مشاہدہ کر سکتے ہیں، ٹھیک اُسی طرح وہ جذبات و حسیات جو اس سے قبل صرف ہماری سماعت تک محدود تھے۔ اُن کے بیان کردہ واقعات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم پر روشن ہو جاتے ہیں۔“

روسی ادب کے اسی خوشہ کو اردو نے بھی ٹوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اب اردو میں بھی ایسے ادیب پیدا ہو رہے ہیں جن کے قصے ایسی بہت سی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ خود سعادت حسن منٹو نے ترجمہ کے علاوہ اسی پنج پر کئی طبع آزمائی اور مختصر ڈرامے لکھے ہیں۔ ان کا ایک قصہ ”مذمومہ“، اب فلمایا بھی جا چکا ہے اور ”اپنی نگریاں“ نام سے عوام میں مقبول ہو چکا ہے۔

۱۰۔ انگریزی اس زبان کے اردو پر اثرات گناے جائیں تو کئی کتابیں تصنیف ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو اپنے موجودہ موقف کیلئے سب سے زیادہ انگریزی ہی کی رہنمائی ہے۔ اس نے انگریزی سے بہت کچھ حاصل کیا ہے اور اس سے زیادہ کر سکتی ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے انگریزوں نے ہندوستان میں صرف انگلستان ہی کی نمائندگی نہیں کی بلکہ پورے مغرب کی کی ہے۔ اسی طرح انگریزی نے بھی دوسری نہ صرف مغربی بلکہ بعض مشرقی جیسے چینی دجا پانی زبانوں کی بھی ترجمانی کی ہے۔ اردو کے ادیب مختلف زبانوں سے راست ترجمہ نہیں کر سکتے تھے اس لئے انہیں انگریزی کا واسطہ اختیار کرنا پڑا۔ انگریزی وہ ضرورتاً جانتے تھے اور خوش قسمتی سے انگریزی اپنے اندر سب کچھ رکھتی تھی۔ چنانچہ اردو پر دوسری زبانوں کے جو اثرات مترتب ہوئے ان کا سب سے زیادہ بڑا سبب اور ذریعہ انگریزی ہی تھی۔ ناشن، فاؤسٹ، تائیس، نصیب وغیرہ غیر زبانوں کے چند مشہور شاہ کار ہیں جو انگریزی کے ذریعہ اردو میں منتقل کئے گئے۔

انگریزی کا بحر بیکار ال ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ یہی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ دنیا کی ہر اہم زبان و ادب کے شاہ کار عبقی ہوں یا جدید اس میں ترجمہ کئے جا چکے ہیں۔ ہر صنفِ سخن پر طب دیاب اس کا ایک انبار ہے جس کا جوجی چاہے نقدِ ظن حاصل کر لے۔

اردو اس معاملہ میں ہندوستان کی سب زبانوں سے زیادہ عالی ظرف ہے اس کی اکتسابی قوت کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے یہ خصوصیت انگریزی اور اردو میں مشترک نظر آتی ہے بلکہ اردو بعض حیثیتوں سے اس پر بھی فوقیت رکھتی ہے خصوصاً اس معاملہ میں کہ اردو آریائی نسل کی زبان ہے۔ یہ پیدا ہوئی اسی گھرانے میں اور پرورش پائی ہندوستانی ماحول میں لیکن ایک خالص سامی زبان عربی سے اس کا بہت قریبی تعلق ہے۔ اتنا کہ اُسے ٹوڑ دیا جائے تو اردو وار دہ نہ رہے گا یا آریائی

رگوں میں سامی خون دوڑ رہا ہے۔ اتنا قریبی تعلق انگریزی کسی سامی زبان سے پیدا نہ کر سکی۔
اُردو کو کسی سے نفرت نہیں۔ ہر زبان کے دروازے اس پر کھلے ہوئے ہیں۔ اُردو کی اثر پذیری کی قابلیت
نے اسے بہت فائدہ پہنچایا ہے۔

اُردو اب جس دور سے گزر رہی ہے وہ ایک عبوری دور ہے اس دور میں تراجم ہی زیادہ ہوتے ہیں۔ ہر زبان کو
اس راہ سے گزنا پڑا ہے۔ کوئی زبان اس راستے کو طے کئے بغیر بلند پایہ نہیں بن سکی۔ ترقی کی منزل کو یہی ایک راستہ جاتا
ہے۔ ترجمہ ہی سے ایک زبان پر دوسری زبانوں کے اثرات پڑتے ہیں اور بعد کو اُسی رنگ میں طبعاً چیزیں جو دہرائی جاتی ہیں
انگریزی افسانے، قصے، کہانیاں، ناول وغیرہ کثیر تعداد میں اُردو میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ ان تراجم نے بہت کچھ
سمجھایا، سکھایا اور سمجھایا ہے اس موقع پر اس کا ذکر ضروری ہے کہ کسی زبان کے صرف افسانے ہی دوسری زبان کے افسانوں
پر اثر نہیں کرتے بلکہ اس زبان و ادب کی مختلف صنفیں بھی کر سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی زبان کی ایک نظم کا ترجمہ
دوسری زبان میں قصے کی صورت میں کر دیا گیا ہو۔ بعض اوقات کسی ناول کا اس طرح ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اس کے مختلف باب
بذات خود افسانہ ہوتے ہیں۔ اس قسم کے ترجمے خیالات کو اُکسائے کا باعث ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اُسی رنگ اور طرز میں
تھوڑے سے اختلافات کے ساتھ مختلف افسانے وجود میں آتے ہیں لیکن ساتھ ہی ہر ایک میں اپنے مصنف کا خاص رنگ
بھی شامل ہوتا ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔

اُردو میں اُن گنت انگریزی ناولوں، افسانوں اور کہانیوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ ناولوں میں اسکاٹ، شرک،
چارلس ڈکنز وغیرہ کو بہت قبولیت حاصل ہوئی۔ مختصر قصوں کے لئے ٹامس ہارڈی، آسکر وائلڈ، برنارڈشا، سیوٹن،
ویلیز، چیسٹرٹن اور خصوصاً گالز وورڈی بہت مقبول ہوئے۔ سیکڑوں قصے ایسے بھی ہیں جو بالکل انگریزی کا ترجمہ ہیں یا اُن
سے ماخوذ لیکن مترجم کے اعتراف نہ کرنے کی وجہ سے اصلی سمجھے جانے لگے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے ایک افسانہ پڑھا
_____ بہت دلکش اور متاثر کن، اُسے طبعاً دہرایا گیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد مجھے بیٹی سن کی ایک نظم
'اینک آرڈن Enoch Arden' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ قصہ بالکل وہی صرف نام بدل دئے گئے تھے، واقعات
نے اجازت نہ دی ورنہ میں اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا کہ ایسا تو نہیں بیٹی سن نے ہمارے افسانہ نگار سے
خیالات مانگ لئے ہوں۔

یوں تو اُردو کا ہر جدید مختصر قصہ نویس انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں سے کسی نہ کسی حد تک ضرور متاثر ہے لیکن
اس صنف کے مختلف شعبوں میں بعض حضرات نے کمال پیدا کیا ہے اور خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:-
۱۔ منشی پریم چند، عنایت اللہ، سدرشن، نیاز فتح پوری، راشد الخیری، اعظم کریموی وغیرہ کو اگر اساتذہ کہا جائے تو

سبب نہ ہوگا۔

۲۔ عتیقی ورومانی، دبستان کے چند ماہ پارے سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، ڈاکٹر زور، جلیل احمد قدوائی، شاہد احمد، منصور احمد، حجاب امتیاز علی، طاہرہ دیوی وغیرہ ہیں۔

۳۔ نفسیاتی و معاشرتی طرز کے قصہ نویسوں میں پروفیسر مجیب، مجنون گورکھپوری، قاضی عبدالغفار، اختر حسین رائے پوری وغیرہ مشہور ہیں۔

۴۔ مزاحیہ نگاروں میں مقبول بطرس، عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد ناکارہ، ملار موزی، شوکت تھانوی، ایم اسلم وغیرہ۔

۵۔ مترجمین میں ممتاز عنایت اللہ، جلیل احمد قدوائی، شاہد احمد، سجاد حیدر، سعادت حسین ڈاور، عابد حسین وغیرہ ہیں۔

۶۔ نفس افسانہ، اس کی ماہیت، اصول، تاریخ و ارتقاء سے بحث کرنے والوں میں خصوصیت سے پروفیسر سرور کی اور مجنون گورکھپوری کے نام لئے جاتے ہیں۔ یہ دونوں اصحاب خود اچھے قصہ نویس بھی ہیں۔

ان کے علاوہ اور بہت سے افسانہ نگار و قصہ نویس ہیں جو مشہور ہیں اور ہر ہے ہیں ان کی تعداد روز افزوں ہے اور یہ اردو کے سہاگ کا ثبوت ہے۔

پھر بھی ہمارے ماخوذ، مترجمہ اور طبعاً و سبباً افسانوں کی تعداد کا انگریزی یا کسی دوسری بڑی مغربی زبان کے افسانوں کی تعداد سے کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ دریا پر جا کر چلو بھر پانی لے آنا — کیا کہیں اپنی ہی بُرائی تو ہے ضرورت اور شدید ضرورت ہے کہ ہر جہت ادب میں اشرافِ قلم دورائے جائیں مختلف خیالات و عقائد کی آمیزش، ہندوستان کا وسیع پس منظر، عربی کا نہ ختم ہونے والا خزانہ، ہندی و فارسی لطافت اور شیرینی کی دوہری — ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ انگریزی کی شعل ابھی روشن ہے۔ اس کی روشنی دور تک پہنچتی ہے۔ ہمارے لئے میدان وسیع ہے، تھوڑی بہت اور تیز گامی میں منزل مقصود پر پہنچا دے گی۔

ہم کو خوش ہونا چاہئے کہ اردو بڑی سخت جان نکلی، شدید مخالفتوں کے باوجود بھی وہ آج زندہ ہے اور پوری طرح صحت مند، اُسے ہندوستان کی عام زبان جو ہونا ہے۔ لیکن

✓ گیسو کے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے شمع یہ سودائی دل سوزی پروانہ ہے اقبال

محمد محمود حسین ایم۔ اے
لکچرار انگریزی عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج ونگل

اندھا رومان

اس کی جھونپڑی شہر سے باہر ہیل کے اس گھنے درخت کے نیچے تھی جہاں جنگل کے پکشی ہر وقت میٹھی میٹھی بولیاں بولا کرتے تھے اور یہی جنگل کے پکشی اس کے ساتھی تھے۔ ان کے سوا اس کا اور کوئی دوست نہ تھا۔ اور کوئی اس کا دوست ہو بھی کیسے سکتا تھا جبکہ دور سے ہی لوگ اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھانے لگتے تھے اور حقارت اور کراہت سے ان کی پیشانیاں سُکڑ جاتی تھیں۔ وہ بہت ہی بد صورت تھی اور اس کی بے ہنگم شکل میں کوئی ذرا سی بھی ایسی خوبی نہ تھی جو انسانی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ سکے۔ لوگ اس پر بھوت پریت کا شبہ کرتے تھے اور اسکے سایہ سے بھی دور بھاگتے تھے۔ بچے کبھی اس کو دیکھ پاتے تو ڈر کے مارے گھنٹوں چیخ چیخ کر رو دیا کرتے۔

وہ غریب ریل کی پٹریوں پر سے پتھر کا کولڈر لاتی اور اسی کو بازاری میں بیچ کر اپنا پیٹ پالتی تھی۔ لیکن تنہا زندگی کی طویل راہیں طے کرنا بہت دشوار ہے۔ بغیر کسی ساتھی کے زندگی کا ساڑھ نوکر بیچ سکتا ہے اور وہ ساڑھ ہی کیا جو کبھی بجایا نہ جائے۔ انسانی روح ہمیشہ اُسی ساز کو چھڑنے کے لئے مضطرب رہتی ہے۔

رجینا بد صورت، بد شکل سی مگر وہ سینچر کی مو رتی تو نہ تھی۔ اس کے جسم میں بھی روح تھی۔ اس کی رگوں میں بھی خون تھا اور اس کا من بھی ایک جیون ساتھی کیلئے دھڑکتا تھا، وہ بھی کسی سے کھیلنا، ہنسنا اور بولنا چاہتی تھی۔ اس کا دل بھی اپنا سارا جیون کسی کو سونپ دینے کے لئے یچین رہتا تھا۔

اس کے پاس ایک پُرانا گڑیا کا جوڑا تھا جس سے وہ بچپن میں کھیل کر رہی تھی اور اب بھی وہی اس کے دل کی دھڑکنوں کا ساتھی تھا۔ جب کبھی وہ بہت اُداس اور افسردہ خاطر ہوتی تو اسی گڑیا کے جوڑے سے دل بہلا لے لگتی وہ ان کے لئے گھر سجاتی، گیت گاتی، بڑے پیار اور چاؤ سے ان کا بیاہ رچاتی اور جب وہ خود انہیں اپنے ہاتھوں سے گلے ملا کر رخصت کرتی تو اس کا دل ایک نامعلوم آرزو کے احساس سے دھڑکنے لگتا۔ اس کی پلکیں نم ہو جاتیں اور وہ پُرانے ہیل کے پٹریں بیٹھ کر بے اختیار رونے لگتی۔

اس کا جیون خوشبو بن کر ہوا میں کھویا جا رہا تھا اور کوئی نہ تھا کہ اس خوشبو کو اپنے من میں بسالے۔

ساون کا مہینہ تھا رات رات بھر بوجھل ہو انہیں چلا کرتیں اور دن دن بھر پانی کی جھڑی لگی رہتی۔ لیکن ساون کی ان تاریک راتوں میں بھی رچیتا کے من کی نگری میں کوئی بجلی نہ چلی۔

وہ کسی دن سے باہر نہ جاسکی تھی اور اب رونی کا بھی سہارا ٹوٹنا نظر آ رہا تھا۔ بالآخر کئی دن کے بعد دھوپ نکلی تو رچیتا بھی اپنی جھونپڑی سے باہر نکلی اور دن بھر کی تلاش کے بعد تھوڑے سے کولے جمع کر کے شام کے دھند لگے میں بازار کی طرف جا رہی تھی کہ اس کی نظر ایک فقیر پر پڑی جو لالھی ٹیک ٹیک کر سڑک پر بھیک مانگتا پھر رہا تھا۔ وہ بالکل نوجوان تھا اور خوبصورت بھی لیکن اس کے آنکھیں نہ تھیں۔ وہ اندھا تھا اور اپنی وضع قطع سے اس ملک کا باشندہ نہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ مسلسل صرا لگا رہا تھا ”مائی اندھے کو ایک پیسہ دینا“ اس کی آواز بھی کچھ اجنبی سی تھی اور اس میں عجیب کشش اور کسک تھی۔

رچیتا کے قدم خود بخود رک گئے اور اس کی نگاہیں اندھے کے تعاقب میں اس طرح کھو گئیں کہ تھوڑی دیر کیلئے وہ خود کو بھی بھول گئی۔ بالآخر جب اس کی آواز دور..... ہوتے ہوئے صرف ایک دھیمے مں میں تبدیل ہو گئی اور رچیتا کی نگاہوں نے اُسے کھو دیا تو وہ اس خواب سے چونکی اور ایک لمحہ کے لئے اس کے سیاہ گالوں پر لاج کی سُرخی دوڑ گئی۔

دن چُھپ رہا تھا اور اس نے ابھی تک کولے نہیں بیچے تھے۔ وہ کیسی بھول کر رہی تھی۔ رات کی رونی کہاں سے آئے گی؟ رونی ٹکی فکر نے من کی پیاس کو تھوڑی دیر کے لئے بجھلادیا اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی بازار چلی گئی۔

جب وہ کولے بیچ کر لوٹی تو سڑکوں اور دکانوں پر روشنی ہو چکی تھی۔ وہ موٹروں، ٹانگوں اور راہ گیروں کی بھیڑ سے بچتی بچاتی جلدی جلدی اپنی سنسان جھونپڑی کی طرف جا رہی تھی جہاں جنگل کے کشی ہر وقت میٹھی میٹھی بولیاں بولا کرتے تھے کہ دفعۃً اس کی نظر پھر اسی اندھے پر پڑی جو ایک گلی کے کنارے خاموش کھڑا ہوا تھا اور وہ غیر ارادی طور پر اس کے قریب پہنچ گئی۔

”تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

اندھے نے اپنی سوتی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور کہا ”پھر کہاں جاؤں؟“

”شاید تم اس شہر میں بالکل اجنبی ہو“ رچیتا کی آواز نہ جانے کیوں کانپ رہی تھی۔

”ہاں، میرا وطن بہت دور ہے“ اندھے نے کھوئی ہوئی آوازیں کہا ”اور مجھے نہیں معلوم میں اس شہر میں کیسے پہنچ گیا۔“

اندھا رومان

اس کی جھونپڑی شہر سے باہر ہیل کے اس گھنے درخت کے نیچے تھی جہاں جنگل کے پکشی ہر وقت میٹھی میٹھی بولیاں بولا کرتے تھے اور یہی جنگل کے پکشی اس کے ساتھی تھے۔ ان کے سوا اس کا اور کوئی دوست نہ تھا۔ اور کوئی اس کا دوست ہو بھی کیسے سکتا تھا جبکہ دور سے ہی لوگ اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھانے لگتے تھے اور حقارت اور کراہت سے ان کی پیشانیاں سُکڑ جاتی تھیں۔ وہ بہت ہی بد صورت تھی اور اس کی بے ہنگم شکل میں کوئی ذرا سی بھی ایسی خوبی نہ تھی جو انسانی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ سکے۔ لوگ اس پر بھوت پریت کا شبہ کرتے تھے اور اسکے سایہ سے بھی دور بھاگتے تھے۔ بچے کبھی اس کو دیکھ پاتے تو ڈر کے مارے گھنٹوں چیخ چیخ کر رو دیا کرتے۔

وہ غریب ریل کی پٹریوں پر سے پتھر کا کونڈہ پٹن لاتی اور اسی کو بازار میں بیچ کر اپنا پیٹ پالتی تھی۔ لیکن تنہا زندگی طویل راہیں طے کرنا بہت دشوار ہے۔ بغیر کسی ساتھی کے زندگی کا ساڑھ نوکر بیچ سکتا ہے اور وہ ساڑھ ہی کیا جو کبھی بچا یا نہ جائے۔ انسانی روح ہمیشہ اُسی ساز کو چھڑنے کے لئے مضطرب رہتی ہے۔

رجینا بد صورت، بد شکل سی مگر وہ سینچر کی مورتی تو نہ تھی۔ اس کے جسم میں بھی روح تھی۔ اس کی نگاہوں میں بھی نین تھا اور اس کا من بھی ایک جیون ساتھی کیلئے دھڑکتا تھا، وہ بھی کسی سے کھیلنا، ہنسنا اور بولنا چاہتی تھی۔ اس کا دل بھی اپنا سارا جیون کسی کو سونپ دینے کے لئے یحییٰ رہتا تھا۔

اس کے پاس ایک پُرانا گڑیا کا جوڑا تھا جس سے وہ یحییٰ میں کھیلا کرتی تھی اور اب بھی وہی اس کے دل کی دھڑکنوں کا ساتھی تھا۔ جب کبھی وہ بہت اُداس اور افسردہ خاطر ہوتی تو اسی گڑیا کے جوڑے سے دل بہلانے لگتی وہ ان کے لئے گھر بناتی گیت گاتی، بڑے پیار اور چاؤ سے ان کا بیاہ رچاتی اور جب وہ خود انہیں اپنے اٹھوں سے گلے ملا کر رخصت کرتی تو اس کا دل ایک نامعلوم آرزو کے احساس سے دھڑکنے لگتا۔ اس کی بلکیں نم ہو جاتیں اور وہ پُرانے ہیل کے پٹریں بیچ کر بے اختیار رونے لگتی۔

اس کا جیون خوشبو بن کر ہوا میں کھویا جا رہا تھا اور کوئی نہ تھا کہ اس خوشبو کو اپنے من میں بسالے۔

ساوون کا مہینہ تھا رات رات بھر بوجھل ہوائیں چلا کرتیں اور دن دن بھر پانی کی جھڑی لگی رہتی۔ لیکن ساوون کی ان تاریک راتوں میں بھی رحینا کے من کی نگری میں کوئی بجلی نہ چمکی۔

وہ کئی دن سے باہر نہ جاسکی تھی اور اب روٹی کا بھی سہارا ٹوٹنا نظر آ رہا تھا۔ بالآخر کئی دن کے بعد دھوپ نکلی تو رحینا بھی اپنی جھوٹری سے باہر نکلی اور دن بھر کی تلاش کے بعد عورتوں سے کوئلے جمع کر کے شام کے دھند لگے میں بازار کی طرف جا رہی تھی کہ اس کی نظر ایک فقیر پر پڑی جو لٹھی ٹیک کر سڑک پر بھیک مانگتا پھر رہا تھا۔ وہ بالکل بوجوان تھا اور خوبصورت بھی لیکن اس کے آنکھیں نہ تھیں۔ وہ اندھا تھا اور اپنی وضع قطع سے اس ملک کا باشندہ نہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ مسلسل صدارت گزار رہا تھا ”مائی اندھے کو ایک پیسہ دینا“ اس کی آواز بھی کچھ اجنبی سی تھی اور اس میں عجیب کشش اور کسک تھی۔

رحینا کے قدم خود بخود درک گئے اور اس کی نگاہیں اندھے کے تعاقب میں اس طرح کھو گئیں کہ عورتوں کی دیر کیلئے وہ خود کو بھی بھول گئی۔ بالآخر جب اس کی آواز دور دور ہوئے ہوتے ہوئے صرف ایک دھیمے ٹمر میں تبدیل ہو گئی اور رحینا کی نگاہوں نے اُسے کھو دیا تو وہ اس خواب سے چونکی اور ایک لمحہ کے لئے اس کے سیاہ گالوں پر لاج کی سُرخی دوڑ گئی۔

دن چھپ رہا تھا اور اس نے ابھی تک کوئلے نہیں بیچے تھے۔ وہ کیسی بھول کر رہی تھی۔ رات کی روٹی کہاں سے آئے گی؟ روٹی کی فکر نے من کی پیاس کو عورتوں کی دیر کے لئے بھلا دیا اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی بازار چلی گئی۔ جب وہ کوئلے بیچ کر لوٹی تو سڑکوں اور دکانوں پر روشنی ہو چکی تھی۔ وہ موٹروں، ٹانگوں اور راہ گیروں کی بھیڑ سے بھرتی پجائی جلدی جلدی اپنی سنسان جھوٹری کی طرف جا رہی تھی جہاں جنگل کے کپڑے ہر وقت میٹھی میٹھی بولیاں بولا کرتے تھے کہ دفعۃً اس کی نظر پھر اسی اندھے پر پڑی جو ایک گلی کے کنارے پر خاموش کھڑا ہوا تھا اور وہ غیر ارادی طور پر اس کے قریب پہنچ گئی۔

”تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

اندھے نے اپنی سوئی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور کہا ”پھر کہاں جاؤں؟“

”شاید تم اس شہر میں بالکل اجنبی ہو“ رحینا کی آواز نہ جانے کیوں کانپ رہی تھی۔

”ہاں، میرا وطن بہت دور ہے“ اندھے نے کھوئی ہوئی آوازیں کہا ”اور مجھے نہیں معلوم میں اس شہر میں کیسے پہنچ گیا۔“

”تورات کہاں کاٹو گے؟“ رجبینا اس کے اور قریب آگئی۔

”یہی سوچ رہا ہوں“ اندھے نے کہا ”برسات کے دن نہ ہونے تو ہمیں کہیں سڑک پر پڑ رہتا۔“

”اچھا تو میرے گھر چلو“ رجبینا کے لہجہ میں ایک منت تھی۔

اندھا جس نے ابھی تک یہ بھی محسوس نہ کیا تھا کہ اس سے بات کرنے والا مرد ہے یا عورت رجبینا کے اس منت آمیز جملہ سے چونک پڑا ”تم کون ہو؟“ اس نے اپنی سوئی آنکھیں رجبینا کی طرف پھیرتے ہوئے پوچھا۔ ”اور ایک اندھے بھکاری سے مذاق کیوں کرتے ہو؟“

”میں نے مذاق تو نہیں کیا“ رجبینا کی ملتچی نگاہیں اندھے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں مگر وہ انہیں نہ دیکھ سکتا تھا۔

”ایک اندھے بھکاری کو بھلا کون اپنے گھر میں جگہ دیگا“ فقیر کا لہجہ اُداس تھا اس نے اپنی سوئی آنکھیں زمین کی طرف جھکا دیں۔

”نہیں“ میں سچ کہتی ہوں، میری جھونپڑی میں بہت جگہ ہے،“ رجبینا نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ دونوں شہر سے باہر پیل کے اس گھنے درخت کی طرف چلے گئے جہاں جنگل کے کپشی ہر وقت میٹھی میٹھی بولیاں بولا کرتے تھے تھوڑی دیر تک وہ بالکل خاموش چلتے رہے۔ پھر رجبینا نے پوچھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”رومان“ اندھے نے جواب دیا۔

”رومان“ رجبینا نے ڈہرایا ”اور تمہارا کوئی ساتھی نہیں“

”نہیں“ میں دنیا میں بالکل اکیلا ہوں“ رومان نے کہا۔

”اور میرا بھی کوئی نہیں۔ رجبینا کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

شہر سے باہر پیل کے اُس گھنے درخت کے نیچے جہاں جنگل کے کپشی ہر وقت میٹھی میٹھی بولیاں بولا کرتے تھے رجبینا اب تنہا نہ تھی۔ وہ اور رومان اب اکٹھے رہا کرتے تھے۔ ان کی زندگی کے سمندر کی بے چین موجیں ساحل سے جالی تھیں اور ان کے من منکھ اور شانتی کے جھوٹے میں ہلکے لے رہے تھے۔ رومان کی نگاہیں سوئی تھیں لیکن اس کے من کی بستی پریم کے راگوں سے آباد تھی۔ رجبینا اس کی پریم بھاری تھی اور وہ رجبینا کے من کا دیوتا۔

وہ دونوں پیل کے اس قدیم درخت کے نیچے جہاں جنگل کے کپشی ہر وقت میٹھی میٹھی بولیاں بولا کرتے تھے ساری دنیا سے میخراپے ہی اندر کھوئے ہوئے تھے۔

رومان اب بھی شہر میں ہر روز بھیک مانگتے جاتا تھا۔ لیکن اب اس کی صدایہ نہ ہوتی تھی کہ ”مائی اندھے کو ایک پیسہ دینا“ اب وہ ہر روز نئے نئے گیت گایا کرتا تھا۔ وہ رجبینہ کے ہاتھوں سے روپ کی قرعین میں ہر روز ایک نیا گیت بناتا۔ جتنی حسین چیزوں کا وہ دنیا میں تصور کر سکتا تھا وہ سب اُسے اپنی رجبینا میں موجود معلوم ہوتی تھیں۔ کوئی خوشنمائی اور کوئی خوبصورتی ایسی نہ تھی جس کو اس نے رجبینا سے منسوب نہ کیا ہو۔

وہ اندھا تھا۔ وہ رجبینا کو دیکھ نہ سکتا تھا اور کبھی اس کے دل میں ایسی خواہش بھی پیدا نہ ہوتی تھی۔ وہ رجبینا کے پریم میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ اگر اس کی آنکھیں ہوتیں تب بھی شاید وہ اس کی بد صورتی کو نہ دیکھ سکتا۔ ایک دن وہ حسب معمول رجبینا کے تصور میں مگن اس کی خوبصورتی کے گیت گاتا ہوا بھیک مانگ رہا تھا کہ چند بازار لڑکے اس کے قریب سے گزرے اور اپنے منہ اس کے کان کے قریب لاکر زور زور سے جلائے ”بھول چنے گامالی اندھے کی بیوی کالی“ اندھا رومان یوں کر حیرت زدہ ٹھہر گیا اور اپنی سوتی آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف اس طرح دیکھنے لگا گویا راستہ بھٹک گیا ہو اور کسی نے اس کے پھولوں اور سنہری تاروں سے بنے ہوئے پریم مند کو دکھا دیا ہو۔ لڑکے تو اسی طرح چلائے ہنسی مذاق کرتے دوڑ نکل گئے مگر اندھا وہاں کھڑا رہا۔

اتفاق سے ایک بوڑھا چوڑی والا اُسی وقت ادھر سے گزرا اس نے لڑکوں کی یہ بات سنی اور اندھے کے اُداس ناظر کو دیکھا اور اس کے پریشان چہرے پر اس کی نظر پڑی تو کچھ سوچ کر وہ اس کے قریب آگیا اور اندھے کی جھولی کے بھاری پن کا آنکھوں ہی آنکھوں میں اندازہ لگایا تو اس کی مفلس نگاہیں چمک اُٹھیں۔ ”رجبینا اور کالی“ اندھے کے لئے یہ تصور بھی ناممکن تھا۔ نہیں یہ بالکل جھوٹ ہے۔ وہ تو اس کے من کا روپ ہے بھلا وہ کیسے کالی ہو سکتی ہے کاش وہ اُسے دیکھ سکتا۔ پہلی بار اندھے رومان کے دل میں ایک لمحہ کیلئے یہ خواہش پیدا ہوئی ”مگر نہیں“ میں تو اُسے اب بھی دیکھ سکتا ہوں وہ تو سپید کنول کا پھول ہے وہ کبھی کالی اور بد صورت نہیں ہو سکتی۔“

بچا اندھا اسی طرح اپنے من سے اُلجھ رہا تھا کہ چوڑی والے نے اس کے بالکل قریب آکر چپکے سے اس کے کان میں کچھ کہا اور چوڑیوں کا ایک بد وضع بد رنگ پُرانا جوڑا اس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

اندھے کا چہرہ چمکنے لگا ”میں جانتا تھا“ مجھے معلوم تھا، یہ جھوٹ ہے۔ بالکل جھوٹ ”وہ زور زور سے کہہ رہا تھا ”میری رجبینا“ وہ تو سارے سنسار کا روپ ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی چاہت کی بے اختیاریوں میں اپنی جھولی کی ساری پونجی چوڑی والے کے ہاتھ میں الٹ دی اور چوڑیوں کا جوڑا جھولی میں چھپا کر ایک بیچین شوق کے ساتھ اپنی بھونپڑی کی طرف چل دیا۔

شام کے بڑھتے ہوئے سایوں میں رجبینا پل کے اس کھنڈے درخت کے نیچے جہاں بگل کے کپڑے ہر وقت میٹھی میٹھی بولیاں بولا

کرتے تھے اپنے رومان کی راہ تک رہی تھی۔ اُس نے دور سے اُسے آتا دیکھا تو دوڑ کر اس کے پیروں کو چھوا اور کپشوں کی تھپی میٹھی بولیوں کے ساتھ اندھے رومان کی آواز یوں بلند ہوئی: ”رجینا بھلا بتاؤ تو میری جھولی میں کیا ہے؟“

”میں کیا جاؤں،“ رجینا نے ہنستے ہوئے کہا۔
 ”دو نہیں رجینا، تمہیں بتانا ہی ہوگا،“ رومان نے رجینا کو اپنے قریب کھینچ لیا۔
 ”اور اگر میں نہ بتاؤں“

”تو میں تم سے روٹھ جاؤں گا۔“

”سچ“

”ہاں“

”تو تو میں بتائے دیتی ہوں، میرے لئے کوئی سوغات لائے ہو۔“ رجینا نے جھولی اسکے ہاتھ سے لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا
 ”بھلا کیا؟ یہ بھی بتا سکتی ہو؟“ رومان کی سوتی آنکھیں رجینا کو گھور رہی تھیں اور اسکے ہونٹ نہ جلتے کیوں کانپ رہے تھے۔
 ”یہ تو تم ہی بتاؤ،“ رجینا نے پریشانی سے جھولی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

رومان نے مسکرا کر اپنی سوتی آنکھیں جھکائیں اور جھولی کھول دی۔

شفق کی غائب ہوتی ہوئی روشنیوں میں رجینا نے دیکھا ایک نہایت شوخ رنگ کا بد وضع سا چوڑیوں کا جوڑا جھولی کی تہ میں چھک رہا تھا۔ اسکے سیاہ چہرے پر ایک لمحہ کے لئے نا اُمیدی کی جھلک پیدا ہوئی لیکن پھر وہ ایک دم چونک پڑی اور جلدی سے چوڑیوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ”آہ کتنی سُندِر چوڑیاں ہیں“ ساتھ ہی اس کی نظر اپنے ہاتھوں پر پڑی اور اسکی کلیں خود بخود دم گھوٹ گئیں اسکی سیاہ کلائیوں میں یہ چوڑیاں کتنی بُری لگیں گی۔ وہ یہ سوچ کر اُداس ہو گئی۔

”لاؤ میں پہنا دوں،“ رومان نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

”نہیں نہیں اس وقت نہیں،“ رجینا نے گہرا کر ہاتھ جھٹھا لئے۔ رومان کی سوتی آنکھیں اس کے ہاتھوں پر جھکی ہوئی تھیں اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ انہیں دیکھ رہا ہے اور وہ ڈر گئی کہ ایسا نہ ہو ان کی بد صورتی اس کے پریم کو بھی اندھا بنا دے۔

”اب تو اندھیرا ہو گیا، سویرے پہن لوں گی۔“ اس نے اپنی گھبراہٹ اور خوف کو چھپاتے ہوئے نرمی سے کہا لیکن اندھے رومان کیلئے اندھیرا اور روشنی سب برابر تھا۔ پھر وہ صبح کا انتظار کیوں کرتا۔ اس نے زبردستی رجینا کے ہاتھ پکڑ لئے اور چوڑیاں پہنا دیں۔

رجینا کی پلکوں سے آنسو ڈھلک آئے لیکن رومان اس سے بچ بچھا۔ وہ بُری دیر تک اسکے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے

وعدہ

میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن
 نہ چھوٹ پھوٹ کے رولوٹ آؤں گا اک دن
 شرارِ عشق کو حبلی بناؤں گا اک دن
 چراغِ جبرِ مشیت بجھاؤں گا اک دن
 جہانِ عہدِ وفا جگمگاؤں گا اک دن
 میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن

(۲)

کبھی میں آؤں گا کلیوں کی آبرو بن کر
 حجابِ گل میں کبھی کاروانِ بو بن کر
 چمن کی خاک سے پھوٹوں گا میں نمون بن کر
 ترے شباب کی نوخیز آرزو بن کر

نسیم و نکمت و شبنم پہ چھاؤں گا اک دن
 میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن

(۳)

سکونِ شام میں امید و بیم بن کے کبھی
 سکوتِ شب میں سحر کا ندیم بن کے کبھی
 نمودِ صبح میں روحِ نسیم بن کے کبھی
 گلوں سے پھوٹ پڑوں گا شمیم بن کے کبھی

ترے مشام کی جنتِ بساؤں گا اک دن

میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن

جگاؤں کا تجھے ہم راز خامشی بن کر
 تمام رات محبت کی زندگی بن کر
 سجاؤں گا تری راتوں کو چاندنی بن کر
 برس پڑوں گا ستاروں سے روشنی بن کر

جمال و نور کے دریا بہاؤں گا اک دن

میں جا رہا ہوں مگر کچھ بھی آؤں گا اک دن

عنانِ شوق کسی سمت موڑتی ہی نہیں
 کسی سے رشتہ جذبات جوڑتی ہی نہیں
 تعلقات کے بندھن کو توڑتی ہی نہیں
 تری نظر مرے دامن کو چھوڑتی ہی نہیں

یہ ضد یہ جبر! میں کیونکر نہ آؤں گا اک دن

میں جا رہا ہوں مگر کچھ بھی آؤں گا اک دن

(۶)

نہ دیکھ جابر و مجبور انکھڑیوں سے مجھے
 نہ دیکھ تشنہ و مخمور انکھڑیوں سے مجھے
 نہ دیکھ رشکِ صدر انکھڑیوں سے مجھے
 نہ دیکھ اپنی طرح چور انکھڑیوں سے مجھے

خود اپنے ہاتھ سے تجھ کو پلاؤں گا اک دن
 میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن

(۷)

جو تیرے لب میں ہے اس نطرت بے زباں کی قسم
 تری زباں میں جو ساکت ہے اس بیاں کی قسم
 تری نگاہ کی غماز داستاں کی قسم
 جو تیری روح میں ہے افسانہ خواں کی قسم

تمام رات کہانی مٹاؤں گا اک دن
 میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن



یہ کوہسار، یہ چشمے، یہ آبشار رواں
 شگوفہ زار کا یہ عکس یہ بہار رواں
 یہ موج موج سر آب جو دیار رواں
 یہ شاخسار مقیم اور یہ شاخسار رواں

اسی ہجوم بہاراں میں آؤں گا اک دن
 میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن

انہیں حسین کناروں کے سائیں شب بھر
 انہیں جمیل نظاروں کے سائیں شب بھر
 انہیں جوان بہاروں کے سائیں شب بھر
 انہیں بلند چناروں کے سائیں شب بھر

بہارِ جن شگوفہ مناؤں گا اک دن
 میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن

ربابِ عشق ہے برسوں سے بے صدا ہر چند
ہے مدتوں سے مرا ساز بے نوا ہر چند
بنا دیا ہے زمانے نے بے وفا ہر چند
میں آج قدرت و آدم سے ہوں خفا ہر چند

نہ سوچ تجھ سے بھی آنکھیں چراؤں گا اک دن
میں جا رہا ہوں مگر کبھی بھی آؤں گا اک دن

شعلِ مہر جھک کر نظر جھکا دے گی
بہار طرہ گل ہائے تر جھکا دے گی
نسیمِ دوڑ کے تاجِ سحر جھکا دے گی
شگفتِ گل ترے قدموں پہ مہر جھکا دے گی

کنول کی اوٹ سے مسکراؤں گا اک دن

میں جا رہا ہوں مگر کبھی بھی آؤں گا اک دن

ترے قریب بہ ہر رنگ و طور آؤں گا
 میں رات بن کے شبستاں میں بارپاؤں گا
 میں خواب بن کے تری آنکھ میں سماؤں گا
 لباس و رنگ کچر دے میں جگمگاؤں گا

ترے وجود کی خوشبو چراؤں گا اک دن

میں جارہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن

یہ شعلہ زار محبت ہے یا جمالِ فریب
 ہو ہے دل سے کئی بار اتصالِ فریب
 جنونِ عشق کی دولت ہے یا وبالِ فریب
 جنونِ عشق حقیقت ہے یا کمالِ فریب

جنونِ عشق کو پھر آزماؤں گا اک دن

میں جارہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن

(۱۴)

جہیں میں صبح لئے، بازوؤں پہ رات لئے
 نظر نظر میں غمِ عشق کا ثبات لئے
 جلو میں اپنے کرم ہائے کائنات لئے
 کبھی یہ دیکھتا ہوں تو ہے شش جہاں لئے

کبھی یہ سوچتا ہوں کچھ نہ پاؤں گا اک دن

میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن

(۱۵)

مدام بارِ محبت اٹھا نہیں سکتا
 وفا کا نغمہ جاوید گانہ نہیں سکتا
 قریب و دور کا مدفن بنا نہیں سکتا
 تجھے یہ ڈر ہے کہ میں جا کے آنہیں سکتا

مجھے یہ خوف ہے تجھ کو نہ پاؤں گا اک دن

میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن

نہ پوچھ لالہ رخ و جنتِ جمال نہ پوچھ
 لرز نہ جائے ترا عالم خیال نہ پوچھ
 میں جا رہا ہوں جہاں سب جہاں کا حال نہ پوچھ
 شروع ”بھوک“ ہے اور ”جھوک“ ہی مال نہ پوچھ

فسانہٴ نعمِ آدم سناؤں گا اک دن

میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن

شعلِ تیز کو نکمت کچل نہیں سکتی
 شمیمِ حبّہ گل سے نکل نہیں سکتی
 نزاکتوں سے یہ گاڑی سنبھل نہیں سکتی
 ”حیات“ صرف محبت سے چل نہیں سکتی

عجیب راز ہے لیکن بتاؤں گا ایک دن

سازِ نظامی

(ناکمل)

(بہا عازت آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

ہمارا مطالعہ

مطالعہ سے یہاں ہمارا مقصد غیر درسی اور عام مطالعہ ہے۔ اس کے بیش بہا فوائد سے کسے انکار ہو سکتا ہے دنیا کے بڑے بڑے لوگوں نے اس کو اپنا محبوب مشغلہ بنایا۔ اس کو اپنی ترقی کا زینہ ٹھہرایا اور اس کے فوائد اور طریقوں کتابیں لکھیں مگر ہم نے ان کا بھی افسانہ کی کتابوں سے زیادہ اثر نہ لیا۔

مطالعہ اہم میں سے اکثر تو اس کا نام زبان پر آتے ہی اُونٹھ کھڑا ایک بھاری بوجھ سے سبکدوش ہو جاتے ہیں لیکن جو اس سے دلچسپی رکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں ان کا مطالعہ ملاحظہ ہو۔

مطالعہ کی میز پر گئے۔ ادھر سے اُدھر تک ایک اُچھتی ہوئی نظر دوڑائی اور آخر کو ایک دیدہ زیب رسالہ اُٹھالیا ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کھولا اور ایک ہی نظر میں پوری فہرست کا جائزہ لے ڈالا۔ ”حالی کا درجہ اُردو ادب میں“ ”اُونٹھ“۔ حالی کے درجہ سے ہمیں کیا تعلق! آگے بڑھے۔ ”بدگمانی“۔ ایک ایکٹ کا ڈرامہ۔ ہاں یہ اخلاقی چیز ہو گی پڑھنا شروع کیا اور بغیر سانس لئے پڑھتے چلے گئے۔ جب ختم ہو گیا تو اس سے آگے ورق گردانی کرتے رہے۔ کوئی پہلی سی مطلب کی چیز مل گئی تو پڑھنے لگے۔ نہیں تو رسالہ کو بند کر کے میز پر رکھ دیا۔ پھر کسی اچھے سے نائٹل ولے رسالہ کو اُٹھالیا دوسرے ہی صفحہ پر ”رنگ تغزل“ از جگر مراد آبادی۔ پڑھنا شروع کیا۔ ”مگر ترنم کا لطف اُٹھانے کے لئے!۔ اس کے بعد کسی اور رسالہ کی ورق گردانی کی اور کچھ اُنڈاز سے ”مطالعہ کر کے“ اُٹھے۔

یہ تو ہمارے مطالعہ۔ اب کتابوں کو لیجئے۔ ان کے انتخاب میں بھی وہی معیار کارفرما رہتا ہے۔ فہرست کتب کھولتے ہیں تو ”ناول و افسانہ“ کا حصہ پہلے نکل آتا ہے۔ اور خدا کے فضل سے کتابیں بھی اتنی موجود ہوتی ہیں کہ حاصل کرنے میں دقت نہیں ہوتی۔ لیکن جن کی نظر انتخاب قدرے جدا گانہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے مطالعہ کی بڑی کامیابی اس میں سمجھتے ہیں کہ اعلیٰ معیار کی کتابیں پڑھی جائیں چاہے وہ اپنے معیار قابلیت پر پوری اتریں یا نہ اتریں اس کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ بس یہی کہ اگر کتاب کا اندازِ بیان ذرا دلچسپ ہے تو نصیحت بھی شکل سے پڑھ پاتے ہیں۔ اور اگر اندازِ بیان بھی مضمون کے مطابق

خشک ہے تو بے پڑھے ہی پچھا چڑا لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو سب سے بڑی خامی ہمارے مطالعہ میں ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم مطالعہ محض سطحی طور پر کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس سے کما حقہ محفوظ اور مستفید نہیں ہوتے پاتے۔ مطالعہ کے دوران میں کوئی بات نوٹ کرنے کے قابل ہی نہیں سمجھی جاتی اور اگر سمجھتے بھی ہیں تو دماغ پر اس کے یاد رکھنے کا پورا پورا اعتماد ہوتا ہے۔

یہ بہت سی کمزوریاں ہیں جن کی بنا پر ہمارا مطالعہ ”پریشان مطالعہ“ کہلایا جاسکتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ان سب باتوں کی ایک یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے ذہن میں مطالعہ کی اصل اہمیت نے جگہ نہیں لی ہے۔ رسکن (Ruskin) نے اس کے لئے بہت اچھی مثال پیش کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہمیں ایک اچھے دوست کی تلاش میں بڑی دقت اٹھانی پڑتی ہے۔ ہمارا دائرہ انتخاب بہت محدود ہوتا ہے اور ہماری اکثر صحبتیں یا تو محض عارضی ہوتی ہیں یا ضرورت پر مبنی۔ ہم جس سے ملنا چاہتے ہیں اس سے نہیں مل سکتے اور اس قسم کی ملاقات سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہم ممکنہ قربانی کے لئے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر ہم غور کریں تو ایک ایسی انجمن اور ایسا دائرہ احباب بھی نہیں مل سکتا ہے جس کے دروازے ہم پر ہمیشہ کھلے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ ہمارے لئے آزاد صحبتیں ہوتی ہیں۔ ہم ان احباب سے جتنک چاہیں ملاقات کر سکتے ہیں وہ کبھی نہیں ٹھکتے۔ وہ پرسکون مکڑی الماریوں کے اندر بیٹھے ہماری راہ دیکھا کرتے ہیں مگر ہم کبھی ان کی طرف توجہ نہیں کرتے۔“

اس سے ظاہر ہے کہ اس طرح آسانی سے ملنے والے دوستوں یعنی کتابوں کے ساتھ ہمارا کیا سلوک ہونا چاہئے یقیناً ایسے دوست کی جو خود ہم پر اتنا ہرمان ہے بہت خاطر مدارات کرنی چاہئے اور اس کی صحبت سے پوری طرح مستفید ہونا چاہئے۔ اس جگہ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جس طرح سب دوستوں کی صحبت ایک سی نہیں ہوتی اسی طرح سب کتابوں کے پڑھنے سے ایک ہی قسم کے نتائج نہیں برآمد ہوتے۔ کتاب کا انتخاب ہی وہ مقام ہے جس پر ہمارا مطالعہ کے سودمند یا ضرر رساں ہونے کا انحصار ہوتا ہے۔

آگے چل کر رسکن اچھی کتاب کی بھی دو قسمیں کرتا ہے۔ اچھی موقتی کتاب اور اچھی دائمی کتاب۔ اچھی موقتی کتاب ہماری وقتی دلچسپی اور لطف کا سبب بنتی ہے۔ اس لئے رسائل اور اخبارات کے مطالعوں زیادہ وقت دینا ٹھیک نہیں اخبارات کا مطالعہ نہایت ضروری ہے اور رسالوں کا بھی مطالعہ کرنا چاہئے لیکن انہیں کا جو زیادہ تر علمی، اخلاقی اور ادبی مضامین پیش کرتے ہوں۔

دائمی کتابوں کے مطالعوں سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی زبان کی کتابیں پڑھی جائیں۔ ابتدائی مطالعہ کے زمانے میں یقیناً مادری اور ملکی زبان ہی کی کتابیں مطالعہ کرنی چاہئیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ باوجود قدرت کے

غیر زبانوں کی کتب کا مطالعہ نہ کیا جائے خصوصاً ہم ہندوستانیوں کیلئے غیر زبانوں بالخصوص انگریزی کی کتابوں کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ موجودہ علوم و فنون کے تمام خزانے انہیں میں مدفون ہیں اسکے ساتھ ہی ساتھ اس مطالعہ سے اس قسم کا فائدہ اٹھانے کی ضرورت کو شش کرنی چاہئے کہ یہ علوم و فنون ہماری ملکی اور قومی زبان میں بھی رائج ہوں اور ایسی وقت ممکن ہے جبکہ اپنی اور پرانی دونوں زبانوں کی کتابوں کے مطالعہ کی عادت ڈالی جائے۔ اس کے علاوہ دیگر زبانوں کی ادبی خوبیوں کو اپنے ادب میں زینت دینے کا بھی موقع ملتا ہے۔

اس کے بعد کتاب کے مضمون کا سوال ہوتا ہے اور اسکے انتخاب میں مطالعہ کنندہ کی عمر کو بڑا دخل ہوتا ہے عام طور پر نوجوانوں کے دل میں یہ خیال ہوتا ہے کہ ناول و افسانہ کی کتابوں کے مطالعہ سے زبان کی دلچسپیوں کے علاوہ جذبات نگاری سے بھی محظوظ ہونے کا موقع ملتا ہے اور وہ ان دونوں اور خصوصاً مؤخر الذکر کو آسان سمجھ کر خود بھی اس میں طبع آزمائی شروع کر دیتے ہیں۔ نیز دو تین افسانہ لکھنے کے بعد اپنے آپ کو ”افسانہ نگار“ سمجھنے لگتے ہیں اور پھر اسی کے ہموکر رہ جاتے ہیں۔ جو اتنی کا زمانہ جوش و امنگ و رائج کا زمانہ ہوتا ہے اس لئے اس زمانہ میں زیادہ تر سوانح عمری کی کتابوں کا مطالعہ کرنا بہتر ہے۔ کیونکہ بقول حالی ”جو قومیں علمی ترقیوں کے بعد بستی اور تنزل کے درجہ کو پہنچتی ہیں۔ ان کے لئے بیوگرافی ایک تازیانہ ہے کیونکہ جب وہ اپنے اکابر و اسلاف کی زندگی کے حالات اور ان کے کمالات دریافت کرتے ہیں تو ان کی غیرت کی رگ حرکت میں آتی ہے اور اپنی گھوٹی ہوئی عزت اور برتری کے دوبارہ حاصل کرنے کا خیال ان دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔“ سوانح کی کتابوں کے علاوہ ادبی کتابیں جن سے ادبی مذاق کی تربیت ہو مطالعہ کرنی چاہئیں یا تاریخی کتابیں جو مذکورہ بالا اثرات کی حامل ہوتی ہیں۔

مطالعہ سطحی نہیں ہونا چاہئے۔ کتابیں ہوں یا رسالے، ہر ایک کے مطالعہ کے وقت ایک نوٹ بک ساتھ رہنی چاہئے اور خاص خاص باتیں نوٹ کر لینی چاہئیں۔ لیکن کتاب ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹا حصہ یا مختصر سے مختصر جڑ جو صدق کے ساتھ کسی مصنف کے قلم سے نکل جائے وہی کتاب ہے۔ اس قسم کے قیمتی ٹکڑے غیر اہم اجزا میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں لیکن اگر آپ صحیح معنوں میں مطالعہ کریں تو حق و صداقت کے وہ جو اہرہریزے بے آسانی جُدا کر سکتے ہیں۔ یہ ہے اصلی مطالعہ اور جب اس قسم کے مطالعہ کا ذوق آپ میں پیدا ہو جائیگا تو کائنات کی ہر شے کا مطالعہ آپ اسی طرح باریک بینی اور معرفت سے کر سکیں گے۔

محمد فصیح الزماں قریشی
متعلم جامعہ دہم و نکل کالج

گلمائے پریشان

جستجو :-

تاروں میں محبت کا جہاں ڈھونڈ رہا ہوں گزری ہوئی راتوں کے نشان ڈھونڈ رہا ہوں
جو میرے لئے منتظر جانبِ در تھی اب تک وہی چشمِ نگراں ڈھونڈ رہا ہوں
دُکھ درد کی ان چاند ستاروں کو خبر کیا؟
کھوئے ہوئے دل کو میں کہاں ڈھونڈ رہا ہوں

مشاہدہ :-

اُن پھول سے ہونٹوں پہنسی دیکھ رہا ہوں جذبات کی فردوس گری دیکھ رہا ہوں
کیا آپ کو سچ مچ مری حالت کی خبر ہے میں آپ کی آنکھوں میں نمی دیکھ رہا ہوں

اتنی سی خوشی بھی نہیں دُنیا کو گوارا
تاروں کی جبینوں پہ شکن دیکھ رہا ہوں

✓ پیام :-

ہو جو احساس تو پتی بھی ہے تلوار کی دھماکا چشمِ بینا ہو تو ذرہ بھی ہے روشن قندیل
اُمّتیں فتنہ تہذیب سے ہوتی ہیں تباہ اس میں آبل کے مکین ہو کہ بنی اسرائیل
کاش فطرت اُسے بروقت طلب کر سکتی
ذہن شاعر میں جو غلطاں ہے اچھوتی تمثیل

✓ محسوسات :-

حقیقت یہ ہے مفہومِ محبت شادمانی ہے جوانی ہی محبت ہے، محبت ہی جوانی ہے
میرا تیرے مٹاؤ سے بھی شاید نہیں سکتا جہاں تک تیری ہستی ہے وہیں تک زندگی گانی ہے
جو مانوس مزاجِ حُسن ہے اُس کے لئے ماہر
تغافل ہی توجہ ہے، ستم ہی مہربانی ہے

ماہر القادری

اورنگ زیب کا گولکنڈہ پر حملہ اور قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ

اورنگ زیب سجا پور فتح کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ جغرافی مشکلات قحط، وبا اور مرہٹوں کے متنازع حملوں نے مغل فوج کو بہت نقصان پہنچایا۔ لیکن عالمگیری استقلال میں فرق نہ آیا اور آخر ستمبر ۱۶۸۶ء (اوائل ذیقعدہ ۱۰۹۶ھ) میں اہل سجا پور نے محاصرے سے تنگ آکر قلعہ کی کنبیاں شہنشاہ کے سپرد کر دیں اور سجا پور کا الحاق ہو گیا۔ اب دکنی سلطنتوں میں سے صرف قطب شاہی سلطنت باقی تھی۔ ۹ دسمبر ۱۶۸۶ء (مطابق ۲۳ محرم ۱۰۹۷ھ) اورنگ زیب شولا پور سے گلبرگہ کی جانب روانہ ہوا اور بقول خانی خان ابوالحسن وسعدت خاں کو خوف اور امید بھرے فرامین بھیجے اور پیشکش وصول کرنے کے لئے ”خفیفہ“ تاکید کی۔

گلبرگہ پہنچ کر شہنشاہ نے ایک ہفتہ قیام کیا اور واپس سے ظفر آباد گیا۔ جہاں سے بیس روز شہر کو پیش خانہ کو حیدر آباد کی جانب روانہ ہونے کا حکم دیا۔ لیکن اسی کا بیان ہے کہ سعادت خاں نے شہنشاہ کا فرمان پا کر پیشکش وصول کرنے میں تفتید کی اور ابوالحسن کو امیدوار عنایات شاہی کیا۔ ابوالحسن نے کہا کہ کسی کم سن خواجہ سرا کو بھیجتا کہ میگات سے جواہرات

ملہ خانی خان جلد دوم صفحہ ۳۲۲۔ ”سد سکندہ گرفت“ ۱۰۹۸۔ اس میں ایک زیادہ ہے

ملہ آثار عالمگیری صفحہ ۲۸۷

ملہ خانی خان جلد دوم صفحہ ۳۲۷

ملہ خانی خان جلد سوم صفحہ ۴۲۰ پر لکھتا ہے کہ سعادت خاں تین دن تین رات ابوالحسن کے دروازے پر بیٹھا رہا،

زیورات لے کر بھیجیوں کیونکہ میرے پاس نہ نقد نہیں لیکن سعادت خاں نے خواجہ سرکو بھیجنے سے عذر کیا۔ اس عرصہ میں عالمگیر کے گلبرگہ پہنچنے کی خبر ملی تو ابوالحسن نے پریشان ہو کر ”حاجب کے ملازموں کو بلایا اور نوعدہ خواہی خواہرات و مہینے آلات بلا تین قیمت بھیجے کہ سعادت خاں اپنے گھر میں رکھے۔ دو تین روز بعد جو کچھ نہ نقد ہو سکے گا بھیجا جائیگا اور باقی رقم جواہرات کی قیمت کا تعین کر کے ان میں محسوب کی جائے گی جس کے بعد سعادت خاں قبض الوصول پیش کش مع ابوالحسن کی عرضداشت اور اپنی سفارش کے شہنشاہ کی خدمت میں بھیجے گا۔ دوسرے روز ابوالحسن اور سعادت خاں دونوں نے چند ہنگی سیوہ شہنشاہ کے لئے روانہ کیا۔ ابھی دو تین ہی روز گزرے تھے کہ شہنشاہ کے گلبرگہ سے حیدر آباد کی جانب کوچ کرنے کی خبر ملی اور معلوم ہوا کہ شہنشاہ عزم بالبحرم کے ساتھ گولکنڈہ فتح کرنے آ رہا ہے۔ ابوالحسن نے سعادت خاں سے جواہرات طلب کئے تو اس نے کہہ دیا کہ وہ تو میں نے شہنشاہ کی خدمت میں بھیج دیئے۔ ابوالحسن فوج برخانہ حب تعین نمود و دو روز ہنگامہ پر خاش درمیان بود۔“

آخر کار سعادت خاں نے ابوالحسن سے کہا کہ میرے قتل سے آپ کو فائدہ نہیں۔ اور نگ زیب کو البتہ ہمانہ بلجائیگا اگر آپ مجھ سے قرض نہ کریں گے تو میں آپ کو بچانے کی امکانی کوشش کروں گا۔ ابوالحسن نے یہ پیغام پا کر ”اڑانکہ سعادت خاں در بعضہ مقدمات خلاف مرضی بادشاہ حق خدمت خود نزد ابوالحسن ثابت کردہ بود۔ ابوالحسن رانیر نظر بر عواقب امور ایں عذر بگوش پند زبوش مسموع گردید و دست از مزاحمت برداشت۔“

معلوم ہوتا ہے کہ ابوالحسن کو عالمگیر کے ظفر آباد روانہ ہونے کے متعلق غلط فہمی ہوئی حالانکہ جیسا خانی خاں کے بیان سے ظاہر ہے اس نے گلبرگہ سے روانہ ہو کر ظفر آباد میں بیس روز قیام کیا جس سے عالمگیر کا مقصد یہ تھا کہ ”باشد کہ آں سیست نشہ برگشتہ سختی از خواب بیدار گردد۔“ لیکن ایسا نہ ہونے پر ۲۶ دسمبر ۱۶۸۶ء کو تنبیہ کیلئے متوجہ ہوا۔

ظاہر ہے کہ اتنا عرصہ پیش کش بھیجنے کے لئے کافی تھا۔ جیسا پورا اوّل ذی قعدہ ۱۰۹۷ھ یعنی ستمبر ۱۶۸۶ء میں فتح ہوا تھا لیکن ابوالحسن نے نہ تو فتح کی مبارکباد بھیجی اور نہ پیش کش۔

لہ حسب بیان خانی خان۔ عالمگیری حکم کے مطابق سعادت خاں کو الحاکم رنہ کرنا چاہئے تھا۔

۱۰۹۷ھ خانی خان جلد دوم صفحہ ۳۲۴

۱۰۹۷ھ خانی خان جلد دوم صفحہ ۳۲۵

۱۰۹۷ھ آثار عالمگیری صفحہ ۲۸۷

اواخر محرم تک تین اور ظفر آباد سے روانہ ہونے پر چار مہینے گزر گئے حالانکہ ابوالحسن کے پاس شہنشاہ کے فرامین آچکے تھے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ ابوالحسن جس نے خود کو شہنشاہ کا ماتحت تسلیم کر لیا تھا قصداً احکام کی خلاف ورزی کر رہا تھا جس سے شہنشاہ میر عبد الکریم وغیرہ پر حملہ کرنے کی وجہ سے بھی ناراض تھا۔ اورنگ زیب کو جواہرات کے خواجے تقریباً دو سال بعد ملے

چنانچہ خانی خان سعادت خاں کی دیانتداری کے ضمن میں کہتا ہے کہ اس نے اپنی نیک سرشتی کی بنا پر خلان مضمی شہنشاہ دو تین معاملات کو شہنشاہ سے پوشیدہ رکھا تھا۔ مثلاً ابوالحسن نے سہاجی کو ایک کثیر رقم بھیجی تھی جس کی اطلاع شہنشاہ کو دوسرے ذریعوں سے ملی۔ سعادت خاں فتح گو لکنڈہ کے بعد حاضر ہونے پر معتبوب ہوا۔ اس نے بہت چاہا کہ ناعد خواجہ بٹے جواہر جن کی قیمت دس لاکھ روپیہ تھی اور جن کے متعلق اسے باز پرس کا بہت خوں تھا داخل کرے مگر متصدیوں نے لینے سے انکار کیا۔ اس طرح ایک سال گزرنے پر متصدیوں نے شہنشاہ سے عرض کیا کہ ”محمد مراد نہ عدد خواجہ جواہر کے نقش مہر موم آں پیدا نیست و دستاویز سیاہ آں بہر متصدیان ابوالحسن نداد بجواہر خانہ می سپارد“ اورنگ زیب نے کہا کہ اس معاملہ میں مجھے اطمینان ہے۔ اس نے اپنے حجابت کے زمانہ میں بعض چیزیں غلط مرضی کی تھیں لہذا سرزنش ضروری تھی۔

چونکہ باوجود انتظار کے ابوالحسن کے پاس سے پیشکش نہیں آئی اس لئے شہنشاہ نے پیش خانہ ظفر آباد سے روانہ کیا اس وقت ابوالحسن کی درخواست معافی کے لئے آئی لیکن اورنگ زیب نے اپنے حاجب کو لکھا کہ اب وقت گزر گیا اور معافی ”نصوّر باطل اور خیال محال“ ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے لکھا کہ اگرچہ ابوالحسن کے ”اعمال قبیح“ بیان سے باہر ہیں۔ لیکن ان میں سے چند یہ ہیں۔

(الف) زمام اختیار ملک و سلطنت کا فروغ کو دینا۔

(ب) سادات و مشائخ و فضلا کو منکوب و مغلوب کرنا۔

(ج) علانیہ فسق و فجور کو رواج دینا۔

(د) شراب نوشی بدستی اور علانیہ کبائریں مشغول ہونا۔

لے محاصرہ میں آٹھ ماہ سے زائد صرف ہوئے۔ فتح کے بعد سعادت خاں حاضر ہو کر معتبوب ہوا اور متصدیوں نے ایک سال کے بعد جواہرات

کے متعلق شہنشاہ سے عرض کیا خانی خان جلد دوم صفحہ ۳۷

۳۷ خانی خان جلد دوم صفحہ ۳۷

(ھ) گفتا جرنی کی مدد پر اصرار کرنا۔

(ن) اوامر و نواہی کی پابندی نہ کر کے خلق اور خدا کی نظر میں مطعون ہونا اور متعدد فرائین بھیجے پر بھی بیوقوفیت

کا لڑنے سے نہ بھگانا۔

(ی) انہیں ایام میں سہنا کو ایک لاکھ روپیہ بھیجنا

ان میں سب سے اہم سیاسی الزام سنہاجی کی مدد ہے جو اگرچہ گو لکنڈہ کی پالیسی کے لحاظ سے جائز بلکہ ضروری تھی لیکن یہ چیز شہنشاہی اعراض و مقاصد کے خلاف تھی اور عالمگیر کی ناراضی کا ایک بڑا سبب ہوئی۔ اس کے علاوہ بیجا پور فتح ہونے سے پہلے اور بعد میں وہاں کے بہت سے سردار مثلاً شیخ منہاج، شترزہ خاں، مصطفیٰ خاں لاری گو لکنڈہ میں پناہ گزین ہوئے اور عالمگیر کے سخت مخالف تھے۔ آئزہ عالمگیری نے ایک اور سبب لکھا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ”بیراہہ رو مسلک بیودہ گرد دی و نادانی طائفہ ایرانی غول بیا با بنی بحایت آں گروہ خذلان پڑدہ مرکب انواع شناعیت بر ملا بودند۔“

عالمگیر کی آمد حاجب کے نام احکام بھیج کر اورنگ زیب گو لکنڈہ کی جانب روانہ ہوا۔ ابوالحسن کو اطلاع ملی تو اس نے شیخ منہاج شترزہ خاں، مصطفیٰ خاں لاری اور دیگر سرداروں کو مقابلہ کے لئے روانہ کیا اور رخصت کرتے وقت کہا کہ عالمگیر کو زندہ گرفتار کر کے اعزاز سے لانا جس پر انہوں نے جواب دیا کہ ہمارا دل عالمگیر کی طرف سے جلا ہوا ہے اور ہم اس کی حرمت نہیں کر سکتے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوالحسن کو اپنی فوج پر اعتماد تھا کہ عالمگیر کے مقابلہ میں فتح پائیگی لیکن شاید اسی طرح جس طرح واجد علی شاہ کو انگریزوں کے خلاف اپنی فوج پر بھروسہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے اورنگ زیب کی قوت کا اندازہ نہ تھا اور غالباً اسی بنا پر وہ خراج بھیجنے میں تعویق کر رہا تھا۔

قلعہ گو لکنڈہ کے گرد ایک مضبوط فصیل ہے جس کا طول چار میل سے کچھ ہی زیادہ ہوگا۔ ستاسی برج اور آٹھ بڑے دروازے ہیں۔ فصیل کے گرد ایک عرض خندق ہے اور قلعہ کے شمالی جانب ایک پہاڑی سلسلہ ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ عالمگیر نے وہیں قیام کیا تھا۔ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ پر زیادہ تر جنوب مشرق اور جنوب کی جانب سے

حملہ ہوئے تھے۔

محاصرہ ۱۷۶۸ء (مطابق ۲۴ ربیع الاول ۱۱۹۵ھ) کو اورنگ زیب نے قلعہ سے ایک کوس کے فاصلہ پر ڈیرے ڈالے اور پہنچتے ہی مورچال کی تقسیم اور اسباب قلعہ گیری فراہم کرنے کا حکم دیا۔ قطب شاہی فوجوں نے ایک وسیع حلقہ بنا کر مغل فوجوں کو گھیر لیا۔ اورنگ زیب نے ان فوجوں پر جو قلعہ کے دامن میں کھڑی تھیں حملہ کرنے کا حکم دیا۔ گھمسان کارن پڑا۔ جس میں دونوں جانب کے بہادروں نے بہادری کے جوہر دکھائے۔ قلعہ سے بھی مسلسل گولہ باری ہوتی رہی اور بان آتے رہے۔ اسی جنگ میں فوج عابد یعنی جین قلعہ خاں سخت زخمی ہوئے اور باوجود علاج کے جانبر نہ ہو سکے لیکن آخر کار قطب شاہیوں کو پسپا ہونا پڑا۔ اسی اثنا میں نواب فیروز جنگ بہادر ابراہیم گڈھ فوج کے آگے اور شہنشاہ نے ان کو سپہ سالار بنا کر محاصرہ کا انتظام ان کے سپرد کیا۔ صفت شکن خاں میر آتش نے ایک ماہ میں چال کو خندق تک پہنچا دیا اور دمدمہ کو قلعہ کے کنارہ تک پہنچا کر اڑدھا پیکر توپیں نصب کر دیں لیکن اس موقع پر صفت شکن خاں اور فیروز جنگ کی چشمک بلکہ مخالفت رنگ لائی اور صفت شکن خاں نے استعفیٰ دیدیا۔ اس کی جگہ صلاحیت خاں مقرر ہوا لیکن اس سے کام نہ بنا تو اس کی جگہ سید عزت خاں میر آتش بنایا گیا۔ اسی اثنا میں شہزادہ معظم کے چند خطوط پکڑے گئے جو ابوالحسن کے نام لکھے گئے تھے۔ شہنشاہ محاصرہ بجا پور کے زمانے ہی سے ناراض تھا خطوط اور قلعہ میں جانے کا ارادہ معلوم ہوا تو مع چار دیگر شہزادوں کے نظر بند کر دیا۔

ایک ناکام کوشش محاصرہ کو تقریباً تین ماہ گزرے تھے کہ (۱۴ رجب ۱۱۹۵ھ) کو شب میں نواب فیروز جنگ بہادر نے ایک بڑے کھانڈے کے محافظوں کو غافل پا کر دو بہادروں کو کمندوں کے ذریعہ فصیل پر چڑھا دیا لیکن اتفاقاً دیوار پر قدم رکھتے ہی ایک کتے نے جو مڑے کھانڈے آیا تھا بھونکنا شروع کر دیا۔ محافظ ہوشیار ہو گئے اور اس وقت انہوں نے بڑے استقلال اور جرأت سے کام لیا۔ مشعلیں روشن کیں اور چراغ لیکر بڑھے۔ حملہ آوروں کو دیکھ کر کمندوں کے رشتے کاٹ دئے جس سے ان دونوں بہادروں کا خاتمہ ہو گیا اور فیروز جنگ کو واپس ہونا پڑا۔ لیکن اس سے قبل شہنشاہ کو فتح کی اطلاع دی جا چکی تھی اور اس نے نوبت بجانے کا حکم دیا تھا۔ سپاہیوں میں خوشیاں منائی جانے لگیں اور آپس میں گفتگو کرنے لگے کہ کل کو لگندہ سے کوچ کر کے گھر جائیگے۔ یکا یک قلعہ سے ایک گولہ آکر گرا جس سے کئی آدمی زخمی ہوئے اس کے بعد گولوں کی بارش ہی شروع ہو گئی جس سے فوج میں سراسیمگی پھیلی اور چھ میگوئیاں ہونے لگیں۔

دریں معاملہ بودند تا خبر آمد کہ چشم زخم عظیم بھوج شاہ رسید

ابو الحسن کو واقعات کی خبر ملی تو اس نے اس گئے کو جس کے بھوئنے سے محافظ ہوشیار ہو گئے تھے زریں جھول پہنائی اور لکھے میں سونے کا پتہ ڈالا۔

(۱۵ رجب ۹۸۷ھ) کو محصورین نے چوٹیوں کی طرح قلعہ سے نکل کر سخت حملہ کیا۔ سید عزت خاں نے مقابلہ کیا لیکن اس جھڑپ میں ستر مغل سپاہی مارے گئے۔ غنیم کے کشتوں کی تعداد نہ معلوم ہو سکی۔ شب میں چند گولے سرابردہ سلطانہ کی قریب آکر گرے تو شہنشاہ نے حکم دیا کہ اس بوج کو جس سے گولے آئے تھے مساکر دیا جائے۔ لیکن اہل قلعہ بلندی پر تھے اور نفل نشیب میں۔ اسکے علاوہ گو لکنڈہ کا فرنگی توپ خانہ بہت مشاق اور قادر انداز تھا اس لئے کامیابی نہ ہو سکی تو اورنگ زیب نے سیڑھی لگا کر خود فصیل پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن ملائین شاہی کی عرض سے باز آیا۔ تین روز مسلسل جنگ ہوتی رہی جس میں بہت کشت و خون ہوا۔ جس کے بعد قطب شاہی فوج نے منتشر ہو کر چھاپے مارنے شروع کئے۔

مغلوں کی مشکلات قطب شاہی فوجیں زبردست مقابلہ کر رہی تھیں خصوصاً شیخ نظام نے چھاپے مار مار کر دہشت بھلا دی تھی لیکن سب سے زیادہ خرابی یہ ہوئی کہ ایک زبردست قحط پڑ گیا اس سال پہلی فصل خنک ہو گئی اور دوسری فصل لشکر کشی اور قلت بارش کی وجہ سے نہ بولی گئی۔ سنبھالی نے لوٹ مار کر کے رسد بند کر دی جس سے اور بھی پریشانی پھیلی اور غلہ اور چارہ کی کمی نے ان کے اوسان خطا کر دیے۔ اتفاقاً اسی زمانہ میں وبا بھی پھیل گئی۔ مغل فوجوں کا حال روز بروز ابتر ہونے لگا اور فوج میں بددلی پھیلنے لگی۔ بہت سے امراء علانیہ اور خفیہ ابو الحسن سے مل گئے۔ اسی زمانہ میں قاضی عبداللہ نائب میر عدل نے عالمگیر سے عرض کیا کہ ابو الحسن کی خطامعاف کر دی جائے کیونکہ گو لکنڈہ پر حملہ احکام شریعت کے خلاف ہے۔ اورنگ زیب نے جواب دیا کہ میرا خیال تھا کہ صرف سفلہ مزاج ہی روپیہ پر فریفتہ ہوتے ہیں لیکن معلوم ہوا کہ یہ چیز عام ہے۔ اسکے بعد لشکر سے خارج کر کے بنگاہ بھیج دیا۔

ظاہر ہے کہ قاضی صاحب منقولات کے مطابق مشورہ دے رہے تھے لیکن عالمگیر معقولات کا قائل تھا اور سیاست وقت کے مطابق گو لکنڈہ کا خاتمہ کر دینا چاہتا تھا۔ قاضی عبداللہ کی گفتگو تمام فوج میں پھیل گئی جو پہلے ہی بد دل ہو رہی تھی ممکن ہے کہ وہ لڑنے سے انکار کر دیتی۔ اس لئے اورنگ زیب نے مناسب سمجھا کہ قاضی کو جس پر ابو الحسن سے رشوت لینے کا شبہ تھا خاص لشکر میں نہ رہنے دیا جائے۔

دونوں لشکروں میں روزانہ جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں لیکن ۱۵ رجب کے آخری ہفتہ میں ایک سخت مقابلہ کے بعد

(۲۸ رجب) کو شیخ نظام بھی مطیع ہو گیا

محاصرہ کو طول پکڑتا دیکھ کر شہنشاہ نے برہانپور سے شاہزادہ اعظم اور بیجا پور سے روح اللہ خاں کو طلب کیا لیکن ان کے لشکر میں آنے سے گرائی بڑھ گئی اور مغل فوجوں کی پریشانی میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس وقت کی حالت نعمت خان عالی نے اپنے شہر آشوب میں بیان کی ہے جس کی تائید آثار تاریخیوں سے بھی ہوتی ہے۔ محاصرہ طول پکڑتا گیا اور چارہا سے زائد عرصہ ہو گیا تو فوج بیچیں ہوئی اور لوگ دُعائیں مانگنے لگے کہ خدا کو لکندہ کے لئے طوفان بھیجے۔ جو آیا تو مگر خود انہی کے لئے۔ وسط شعبان میں دو تین روز بڑی زبردست بارش ہوئی جس میں شاہی لشکر کا بڑا نقصان ہوا۔ عین اس وقت اہل قلعہ نے حملہ کر دیا۔ سلیم خاں حبشی نے غار میں چھپ کر اور صف شکن خاں نے جو ”نسبت بہ دیگر شجاعان زیادہ بدل و جان در تخیر قلعہ می کوشید“ خود کو مودوں میں گر کر اپنی جانیں بچائیں۔ حملہ آور عزت خاں میراٹش اور سربراہ خاں عرف جلال چلیہ اور بارہ منصبداروں کو پکڑ کر قلعہ میں لے گئے تاکہ محصورین کو اطمینان دلائیں۔ طوفان کی خبر پر کامیاب کرنے کی خاطر ستر استی ماتھیوں کے ساتھ مدد کے لئے بھیجا۔ مگر اہل قلعہ کے تو پچھانے لے ماتھیوں کے منہ پھردے اور پانی تھم جانے کے بعد ہی ان لوگوں کو واپس ہونے کا موقع ملا۔ عزت خاں اور سربراہ خاں غیر اہل حسن تین زہمان کھ کمرہ اپس کیا لیکن سربراہ خاں کو انبار خانہ غلہ اور ذخیرہ یاروت خانہ دکھایا۔ اور ایک عرضداشت اور زبانی پیغام دیکر شہنشاہ کے پاس بھیجا۔

عرضداشت شہنشاہ نے لاپرواہی کے الزام میں ان لوگوں کے منصوبوں میں کمی کردی اور ابوالحسن کی عرضداشت فیروز جنگ کے پاس بھیجی کہ اگر کوئی چیز قابلِ عرض ہو تو اطلاع دی جائے۔ اس عرضداشت اور پیغام کا حاصل یہ تھا کہ میں خود کو آپ کا خادم تصور کرتا ہوں۔ قلعہ فتح ہونے پر ضرور کسی کے سپرد کیا جائے گا لیکن یہ ملک اس قدر ویران ہو چکا ہے کہ اسے آباد ہونے کے لئے سات آٹھ سال درکار ہوں گے۔ یہاں کا حاکم شہنشاہی خزانہ سے مطالبہ کرے گا۔ اس لئے درخواست یہ ہے کہ مجھے ہی کو یہاں کا حاکم رکھا جائے۔ ”اگر التماس عاجز قبول افتد بعد معاودت ہر منز لے کمر در سرحد اس اللہ محقر مضرب خیام گرد کرد و روپیہ تسلیم دیوانیان سرکار خواہم نمود و بعد ہر یورشے کہ قدم مبارک بجائے حصار قلعہ رسید کرد و روپیہ طریقت نثار قدم مبارک میگزارم“

یہ عرض اس لئے ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کا زیادہ خون بے شہنشاہ کی فوج وطن اور بال بچوں سے دور

لے خانی خاں اسے غیرت خاں اور نعمت خان عالی عزت خاں لکھتا ہے اور یہی صحیح بھی ہے ملاحظہ ہو وقائع گو لکندہ نو لکھنؤ صفحہ ۵۴

”ابن عزت خان است کہ بہ خواری تمام دست بہ بند داده“ اور صفحہ ۵ ”ہمد را بہ عزت پیش آمدہ بہ عزت پیش انداختہ“

لے خانی خاں جلد دوم صفحہ ۳۴۹

رہے اگر میری درخواست قبول نہو اور آپ کچھ مدت اور تضييع اوقات کرنا چاہیں تو فوج کے لئے پانچ چھ لاکھ من غلہ انبار خانہ سے جسے جلال چلیہ دیکھ گیا ہے حضور کی خدمت میں بھیج دوں گے
اورنگ زیب نے درخواست کا مضمون معلوم کر کے کہا کہ اگر ابو الحسن ہمارے حکم سے باہر نہیں تو دست بستہ حاضر ہو۔ اس وقت جیسا میری موت کا تقاضا ہو گا عمل کروں گا۔

ابو الحسن کی اس درخواست سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شہنشاہ کا مذاق اڑا رہا تھا اور یہ ایک چال تھی اگر اورنگ زیب اسے قبول کر لیتا تو شہنشاہی وقار کو صدمہ پہنچتا۔ نہ قبول کرنے کی صورت میں فوج میں کئی رسد کی وجہ سے بیدی اُصلیتی چنانچہ یہی ہوا اور سپاہیوں نے کنا شروع کیا کہ اگر شہنشاہ غلہ ہی قبول کر لیتا تو ہم بھوکوں نہ مرنے۔

اس کے علاوہ ابو الحسن کے لئے اس قدر روپیہ دینا ناممکن تھا اگر واقعی ابو الحسن اس قدر زرخیز دے سکتا تھا تو اسے محاصرہ سے پہلے ہی دیدینا چاہئے تھا۔

عزت خاں کی گرفتاری پر صلابت خاں کو دوبارہ میر آتش مقرر کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب شہنشاہ کو بھی ضد ہو گئی تھی چنانچہ اس نے عرضداشت کو زیادہ اہمیت نہ دیکر برار کے متصدیوں کو حکم دیا کہ دو گز لمبے اور ایک گز چوڑے پچاس ہزار پھیلے بنا کر مع دیگر مصالح قلعہ گیری روانہ کریں تاکہ دوبارہ خندق بھری جائے۔

صف شکن خاں اسید عزت خاں کی گرفتاری پر صلابت خاں کو دوبارہ میر آتش مقرر کیا گیا۔ صف شکن خاں پر اس کے مخالفوں نے مدد کرنے کا الزام لگایا۔ اسی اثناء میں صف شکن خاں نے جو بجلائت دیکر اہل ایران محاصرہ میں زیادہ کوشش کر رہا تھا۔ ایک ایرانی مصاحب سے جس نے کہا تھا کہ قلعہ میں سادات و مومنین میں ان کی خرابی کیلئے کیوں کوشش کرتے ہو کہا کہ ”اگر امام حسین خود درین قلعہ است در تنجیر این قلعہ خواہد کوشید“۔^۱

یہ بات فوج میں پھیلی اورنگ زیب کو معلوم ہوا تو صف شکن خاں مغضوب گردید و چند روزانہ نظر اعتبار انداختہ بلکہ مقید ساختہ اموال اور بضبط آوردہ۔^۲

شہنشاہ نے عزت خاں کی جگہ صلابت خاں کو مقرر کیا لیکن ان سے کام نہ ہو سکا اور صف شکن خاں کے بچلکے دینے پر کہ دوسرے بڑج کی طرف سے کنگرہ تک مورچاں پہنچا دوں گا۔ شہنشاہ نے اسے مارا کر دیا اور اس نے بڑی تندہی اپنا کام شروع کیا۔ اس عرصہ میں نقیب کھو دی جا رہی تھیں (۱۹ شعبان) کو اطلاع دی گئی کہ تینوں نقیب تیار ہیں

صرف آگ دینے کی دیر ہے۔ لیکن ان نقبول کی اطلاع عبدالرزاق لاری کو ہو گئی تھی۔ اس نے بڑی کوشش سے انکے دہانے معلوم کر لئے۔ ایک نقب بالکل خالی کر دی اور باقی دو سے جتنی ہو سکی باروت نکال کر ان میں پانی بھرا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اڑنے پر قلعہ والوں کا ہمت کم نقصان ہوا اور چونکہ وہ بیرونی جانب اڑی تھیں اس لئے ان کا سارا زور شہنشاہی فوج پر جو آگے بڑھ رہی تھی صرف ہوا۔ کئی ہزار لوگ مارے گئے جن میں چند نامی سردار بھی تھے۔ اسی اثناء میں محصورین نے باہر نکل کر دمدموں اور مورچالوں پر حملہ کر دیا تاکہ ان مرحلوں پر قبضہ کر لیں جنہیں کئی ماہ کی کوشش کے بعد مغلوں نے حاصل کیا تھا۔ اس روز بڑی خونریز لڑائی ہوئی۔ اور اگرچہ مغلوں کے پانچ سو سے زائد (حشر گاہ) آدمی مارے گئے لیکن انہوں نے جرأت سے کام لیا اور قریب تھا کہ قلعہ میں داخل ہو جائیں یکا یک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی شہنشاہ بذات خود اس جنگ میں توپوں کی زد پر کھڑا مقابلہ کر رہا تھا لیکن طوفانِ باد و باران نے مغلوں کے منہ پھیر دئے۔ محصورین نے چہرہ دستی دکھائی اور بہت سی توپیں اور پھیلے اٹھالے گئے۔ جن توپوں کو نہ لیجا سکے انہیں خراب کیا۔ پھیلوں سے فضیل کے رخنے بھر دئے اور اسی پھرتی سے کام کیا کہ مغل سپاہی حیران رہ گئے اور جا دو اور سچ کا کرشمہ قصور کیا۔ دوسرے روز تیسری نقب کو آگ لگا دی گئی تو وہ نہیں اڑی اس وقت معلوم ہوا کہ باروت سچڑائی گئی ہے جس پر پورش دوسرے روز پر ملتوی کی گئی چونکہ فیروز جنگ زخمی ہو گئے تھے اس لئے فوج کی کمان شاہزادہ اعظم کو دی گئی۔

چند روز بعد ارکانِ سلطنت کے عرض کرنے پر کہ ابوالحسن کا عدم وجود یکساں ہے اور وہ خود ہی تھوڑے دن میں اطاعت کر لے گا۔ عالمگیر نے حکم دیا کہ حیدر آباد کے ساتھ دارالجماد کا اضافہ کیا جائے۔ عبدالرحیم خاں میوات کو حکم دیا کہ شہر سے غیر اسلامی رسموں اور بدعتوں کو موقوف کیا جائے۔ محاصرہ کی سختی سے تنگ آکر امراء ابوالحسن نے مطیع ہونا شروع کیا۔ ابوالحسن نے شیخ منہاج کو اس افواہ پر کہ وہ بھی عالمگیر کا مطیع ہونے والا ہے قید کر دیا۔

اب اعیان میں سے صرف عبدالرزاق لاری اور عبداللہ خاں پنی افغان رہ گئے۔ ان کو بھی لالچ دیا جانے لگا۔ عبدالرزاق نے صاف انکار کیا، بے ادبی سے فرمان چاک کر دیا اور کہا کہ ”میرے جنگ جنگ کر بلا کی طرح ہے۔ عبدالرزاق کو امید ہے کہ اُن ۲۲ ہزار میں سے نہ ہوگا جنہوں نے بیعت کر کے شہید کر بلا کے گٹھے پر خنجر چلایا بلکہ وہ ان ۲۷ نفوس میں سے ہوگا جنہوں نے سرخروئی دُنیا و دین حاصل کی تھی

اورنگ زیب نے عبدالرزاق کی نمک حلائی پر دل میں آفریں کہی اور محاصرہ میں زیادہ سختی کرنے کا حکم دیا۔ اسی زمانہ میں اس نے مٹی اور لکڑی کا ایک حصار قلعہ کے گرد بنوا کر دروازوں پر سخت پہرہ مقرر کر دیا تھا تاکہ قلعے والوں کے تعلقات بیرونی دُنیا سے بالکل منقطع کر دئے جائیں۔ ان حالات میں کئی مرتبہ قریب تھا کہ قلعہ پر قبضہ ہو جائے لیکن چونکہ محافظان قلعہ بہت ہوشیار رہتے تھے اس لئے مغلوں کو ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ آخر کار دَاسل کو ۱۶۸۷ء یعنی ماہ ذیقعد ۱۰۹۵ھ کے آخر میں عبداللہ خاں اپنی فرشتاں پی کی وساطت سے روح اللہ خاں سے مل گیا۔ روح اللہ خاں ہنسٹ خاں 'صف لشکر خاں اور خواجہ مکارم دہلویوں پر چڑھ کر قلعہ کے اندر داخل ہو گئے اور قلعہ کا دروازہ کھول دیا تو محمد اعظم بھی اپنی فوج کے ساتھ اندر آ گیا۔ عبدالرزاق نے شور و غل سُن کر دیوانہ وار حملہ کیا لیکن انتہا سے زیادہ زخمی ہو کر نگینہ باغ میں گھوڑے سے گر کر سہویش ہو گیا۔ اطلاع ملنے پر اورنگ زیب نے خاص طور پر دو جراح بھیج کر اس کا علاج کرایا اور اچھے ہونے پر اسے اور اس کے بیٹے کو منصب دینا چاہا لیکن اس نے قبول نہ کیا۔

ابوالحسن کو مغلوں کے قلعہ میں داخل ہونے کا حال معلوم ہوا تو اس نے مقابلہ بے سود سمجھا۔ محلات میں سب کو تشفی اور دلا سادے کرنا خواندہ مہمانوں کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اور جس وقت روح اللہ خاں وغیرہ آئے تو ان سے شامانہ طریقہ سے پیش آکر دسترخوان بچھانے کا حکم دیا۔ روح اللہ خاں سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے سوال کیا کہ کھانے کا یہ کونسا وقت ہے؟ ابوالحسن نے جواب دیا کہ میرا یہی وقت ہے۔ روح اللہ خاں نے پھر کہا کہ ”ایسے وقت میں آپ کو کیونکر رغبت ہو سکتی ہے؟ اس کے جواب میں ابوالحسن نے کہا کہ میرا عقائد یہ ہے کہ خدا کسی وقت اپنے بندوں سے نظر لطف نہیں اٹھاتا۔ میرے بزرگوں نے بڑے آرام سے زندگی بسر کی لیکن خدا کی مصلحت تھی کہ پندرہ سولہ سال لباس فہری میں گزاروں۔ اس کے بعد یکایک خدا نے مجھے بادشاہ بنادیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب کوئی ہوس باقی نہیں رہی میں نے لاکھوں بخشے اور کروڑوں دئے۔ اب مجھے بعض اعمال ناشائستہ کی سزا مل رہی ہے۔ جو مجھ سے زمانہ حکومت میں سرزد ہوئے۔ خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے عالمگیر ایسے دیندار بادشاہ کے اختیار میں دیا ہے۔

ابوالحسن کے اس برتاؤ اور گفتگو سے مخالفین بھی دم بخود رہ گئے۔ اس وقت وہ ایک مافوق الانسان مہتمی معلوم ہوتا تھا۔ اس گفتگو کے بعد وہ شاہزادہ اعظم کے پاس گھوڑے پر سوار ہو کر گیا اور اظہارِ بشارت کر کے گلے سے مالائے مروارید نکال کر شاہزادہ کو پہنادیا۔ شاہزادہ نے بھی اسے تسلی دی۔ عالمگیر نے حاضر ہونے کی تکلیف نہ دیکر

۲۷ خانی خان جلد دوم صفحہ ۳۶۱۔ چونکہ ۲۲ ربیع الاول کو محاصرہ شروع ہوا، اس لحاظ سے عالمگیری ذی قعد ۴، ذی الحجہ ۹۸۷ھ مطابق ۱۱ اکتوبر ۱۶۸۶ء کو قلعہ میں داخل ہوئیں۔

ابو الحسن اور فتح گو لکنڈہ کے نتائج

شہنشاہ نے ابو الحسن کو جانسپار خاں کے ساتھ گو لکنڈہ روانہ کر دیا۔ بعض مورخ اعتراض کرتے ہیں بجا پور اور گو لکنڈہ دونوں کی تقریباً یکساں حالت اور مماثل مسلک تھا پھر اورنگ زیب نے سکندر عادل اور ابو الحسن کے ساتھ برتاؤ میں کیوں امتیاز کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ابو الحسن سے کچھ تو اصحاب کبار پر سب و شتم کے باعث اور کچھ اس محاصرہ کی سختیوں کے باعث جو اسے اور اس کی فوج کو اٹھانی پڑیں اورنگ زیب سخت ناراض ہو گیا تھا اور اسے ایک قسم کی ضد سی ہو گئی تھی کہ وہ قلعہ فتح کرنے کے بعد ہی وہاں سے قدم اٹھائے گا۔ اس کے علاوہ ابو الحسن کو متعدد مرتبہ اورنگ زیب نے سنا جی کی مدد نہ کرنے کے لئے فراہم بھیجے۔ مگر اس نے پروانہ کی اور آخر وقت تک مدد کرتا رہا۔ پیشکش نہیں بھیجی اور شہنشاہ کے آنے کی خبر پا کر سرداران فوج کو حکم دیا کہ زندہ گرفتار کر کے لانا۔ اس کے برتاؤ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ شہنشاہ کا مذاق اڑا رہا ہے۔ چونکہ شہنشاہی فوجوں کو ناکامی ہوئی تھی اس لئے شہنشاہ کے غصہ میں اور اضافہ ہو گیا لیکن ان اسباب میں سب سے زیادہ اہم سبب گو لکنڈہ کے سرداروں کی فاداری تھی چنانچہ اگرچہ بہت کمرا مجبوراً مطیع ہو گئے لیکن ان کے متفق نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کس وقت ابو الحسن کی موافقت میں کھڑے ہو جائیں گے۔ بلکہ لڑاکو لاری کی غیر تزلزل اور بے بدل فاداری شہنشاہ کی نگاہ میں کچھ نہ چکا تھا اگر ایک دشمن عبدالرزاق کے مانند ابو الحسن کے پاس ہوتا تو قلعہ گو لکنڈہ فتح کرنے کو عرصہ درکار ہوتا۔ ان حالات میں ابو الحسن کو شکر میں رکھنا مصلحت سے بعید تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ابو الحسن کو بہت جلد دولت آباد روانہ کر دیا۔

گو لکنڈہ کی اس زبردست مقاومت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ابو الحسن ایک دوسرا ہی ابو الحسن تھا اور وہ ابو الحسن نہ تھا جسے مغل مورخ اور عام سیاح پیش کرتے اور ہمیشہ عیش و عشرت میں مبتلا بتاتے ہیں۔ ایسی فاداری کا اظہار اور ایسا زبردست مقابلہ معمولی لوگوں کیلئے نہیں کیا جاتا۔ اس سے رعایا اور امراء میں ابو الحسن کی مقبولیت کا پتہ چلا سکتا ہے۔

بعض لوگوں کا اعتراض ہے کہ اورنگ زیب نے دکنی سلطنتوں کا خاتمہ کر کے ایک بڑی سیاسی غلطی کا رعباب

کیا اور اس طرح مرہٹوں کو مغلیہ سلطنت کا خاتمہ کرنے کا موقع دیا جنہیں دکنی سلطنتیں ابھرنے نہیں دیتی تھیں۔ مگر حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ اعتراض اس حد تک غلط ہے کہ اورنگ زیب اس کا ذمہ دار تھا۔ کیونکہ فتوحات دکن کا آغاز اکبر کے عہد سے شروع ہوا۔ جسے جہانگیر اور شاہ جہاں نے جاری رکھا۔ چنانچہ انہی دو شہنشاہوں کے زمانہ میں ۱۶۳۲ء تا ۱۶۵۷ء کے اہم معاہدے ہوئے جن سے دکن کی سلطنتیں سیاسی لحاظ سے مغلوں کی مطیع ہو گئیں جو ہر بات پر داخلی معاملات میں بھی مداخلت کرنے لگے۔ مرہٹے جہانگیر کے عہد میں ایک قوم بن رہے تھے۔ شاہ جہاں کے عہد میں انہوں نے بہت کچھ قوت حاصل کر لی۔ اس کے ذمہ دار نظام الملکی اور عادل شاہی دربار تھے جن کی نہایت ابتر حالت تھی۔ شاہ جی اور سیوا جی کو اس ابتری سے فائدہ اٹھا کر کامیابیاں حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اورنگ زیب نے ابتدا میں ان کی قوت کو محسوس نہیں کیا۔ اس کے ابتدائی حملے شہنشاہی وقار کی حفاظت کے لئے ہوئے لیکن سورت کی تباہی اور حجاج کے جہازوں پر حملوں نے اسے دکن کی طرف متوجہ کیا۔ اگرچہ جے سنگھ نے سیوا جی کو اطاعت پر مجبور کر دیا تھا لیکن دربار سے بھاگ کر اس نے پھر شورش شروع کی۔ جس میں اسے گولکنڈہ اور بیجا پور سے بہت مدد ملی۔ اگر یہ تیغوں قوتیں ایک مدافعتی معاہدہ کر لیتیں تو البتہ مغلوں کا مقابلہ کیا جاسکتا اور سیاسی لحاظ سے مفید ہوتا مگر ایسا ہوا اور نہ ہو سکتا تھا کیونکہ سیوا جی نے اپنی سلطنت میں بجا پور اور گولکنڈہ علاقوں پر قبضہ کر کے قائم کی تھی اور لوٹ مار ہی میں اس کا فائدہ تھا۔ اس لحاظ سے ضرورت اس امر کی مقتضی تھی کہ وہ سیوا جی کے بڑھتے ہوئے خطرے کے خلاف اگر مغلوں سے اتحاد نہ پیدا کرتیں تو کم از کم آپس میں ہی متحد ہو جاتیں مگر ایسا نہ ہوا اور سیوا جی کے بعد سنہا جی سے بھی اسی قسم کے تعلقات رہے اور مغلوں کے خلاف مدد دی جاتی رہی۔ آخر کار بڑے بانی پور کی تباہی اور شہزادہ اکبر کی دکن میں آمد پر خود اورنگ زیب کو دکن آنا پڑا معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کا ارادہ اس وقت بھی صرف مرہٹوں کی سرکوبی کا تھا چنانچہ جس وقت علمائے بیجا پور کے ایک وفد نے عرض کیا کہ بیجا پور ایک اسلامی سلطنت ہے اس پر حملہ شرع کے خلاف ہے تو اورنگ زیب نے جواب دیا کہ میں آج واپس جانے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ سنہا جی کی مدد نہ کی جائے اور اسے میرے سپرد کر دیا جائے جس نے لوٹ مار اور قتل و غارت سے آفت برپا کر رکھی ہے۔

اس لوٹ مار اور مسلسل لشکر کشیوں کے باعث دکن کا شاداب علاقہ جبری طرح تباہ ہوا اور چونکہ اورنگ زیب کے بعد معظم کے عہد میں سلطنت میں ابتری پھیل گئی تھی اس لئے عرصہ تک پینے کا موقع نہیں ملا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے اسباب میں ایک سبب کئی فتوحات ہیں۔ یہ خیال بڑی حد تک صحیح ہے گو اس کے ساتھ ہی دوسرے وجوہ پر بھی نظر رہنی چاہئے۔ ہندوستان قدیم کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو راجاؤں

کے عہد اور علاء الدین محمد تغلق کے زمانوں میں بھی دکن زیادہ عرصہ تک شمالی ہند کا تابع نہیں رہا بلکہ ہر مرتبہ تنہا ہی عرصہ بعد خود مختاری حاصل کر لی۔ اس کے درجہ زیادہ تر جغرافیہ ہیں۔ شمالی ہند کی جغرافیہ حد و ندھیا چل پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس زمانہ میں آجکل کے سے وسائل نقل و حمل موجود نہ تھے۔ شمالی فوج کو نئے ملک نئی آب و ہوا اور نئے موسموں سے سابقہ پڑتا تھا جسے وہ عرصہ تک برداشت نہ کر سکتے تھے۔ وطن اور بال بچوں کا خیال الگ پریشان کرتا تھا۔ بارش کی کمی بیشی طوفان قحط پہاڑی علاقے اور خود یہاں کے باشندوں کی بردست قوتِ مقاومت حملہ آوروں کے راستے میں ہر قدم پر مشکلات حائل کرتی تھی۔

شاہ جہاں اور عالمگیر کے عہد میں سلطنت مغلیہ اپنی جغرافیہ حدود سے بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ اورنگ زیب نے اگرچہ مرہٹہ قوت کو منتشر کر دیا اور ان کے قلعہ یکے بعد دیگرے فتح کر لئے تھے لیکن یہ قوت ختم نہیں ہوئی تھی اگر اس کے جانشین بھی اسی کے مانند جبری باہمت اور مستقل مزاج ہوتے تو یہی سہی قوت کا بھی خاتمہ کر دیتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ معظم اور اعظم کی جنگ نے انتشار اور لامرکزیت پیدا کی۔ اس کے بعد بادشاہ کی کاہلی نے امراء کو من مانی حرکتیں کرنے کا موقع دیا۔ مرہٹوں نے اپنی منتشر قوتوں کو پھر جمع کیا اور اب وہ دکن سے شمال تک لوٹ مار کرنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت جلد ایک مرہٹہ سلطنت قائم ہو جائیگی۔ لیکن ملائیم کی جنگ پانی پت نے ان کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو ہمیشہ کے لئے روک دیا جس کے بعد ایک تیسری طاقت یعنی ”کمپنی بہادر“ کو آگے بڑھنے کا موقع ملا۔

عبدالوہاب مسلم ایم۔ اے (جامعہ عثمانیہ)

آخری تحفہ

امتحان کی گھڑیاں آتی توبہ! کتنی کٹھن گزرتی ہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں کسی نہ کسی طرح ان کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے کالج کی رومان انگیز زندگی پر تو پوری طرح ان کی حکومت رہتی ہے۔ گرمائی چھٹیوں شروع ہونے والی تھیں امتحانات ختم ہو رہے تھے اور ہمارے ہاسٹل کی فضا سونی ہوتی جا رہی تھی۔ امتحانات ختم ہو گئے۔ فرزند ان جامعہ نے حسرت بھری نظروں سے اُس سرزمین پر نظر ڈالی۔ جہاں ان کی زندگی کے بہترین دن گزر چکے تھے۔ مہنسی، خوشی، چہل پہل میں کمی ہو رہی تھی۔ یکے بعد دیگرے لڑکے ہاسٹل سے سدھار رہے تھے۔ کتنے ہی ایسے تھے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کالج چھوڑ رہے تھے۔ آہ! یہ زندگی ان کے لئے خوشگوار خواب بن کر رہ جائے گی۔ اپنے کمرے میں بڑے بڑے میں ان ہی خیالات میں گم تھا کہ موٹر کے پیٹوں کی آواز سنائی دی۔ میرا آخری ساتھی بھی رخصت ہو رہا تھا۔ ہاسٹل میں اب میرے سوا کوئی نہ تھا۔ مجھ سے کمرہ میں ٹھہرا نہ گیا۔ تنہائی کے احساس نے مجھے ورائڈے میں لاکھڑا کیا۔ دور تک ہرے بھرے پودوں کی قطاریں تھیں لیکن سب کے سب چُپ سادھے کھڑے تھے۔ ایک پھول جس کی نیلی نیلی رنگت بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی میری تنہائی پر مسکرا رہا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا چلا گیا۔ اس ارادے سے کہ اسے توڑ لوں۔ بڑا شگفتہ تھا وہ۔ میں اُسے اپنے ہاتھوں میں کھلانا چاہتا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر میں نے اپنی انگلیوں کو جنبش دی ہی تھی کہ مٹا مجھے خیال آیا۔ وہ بھی تو یکساں تنہا ہی ہے۔ میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا مجھے اس سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ نہیں نہیں اب میں اسے کبھی نہ توڑ دوں گا۔ وہ میرا ساتھی رہے گا۔ دو تین بار اسے سونگھ کر میں باہر نکل گیا۔

رات کے کھانے سے فارغ ہوا تو سفید دودھ سی چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ میں نے کمرہ مقفل کر دیا اور ورائڈے میں چہل قدمی کرنے لگا۔ وہی پھول۔ میرا ساتھی۔ میری ہی طرح یگا و تنہا۔ ہوا کے ہلکے ہلکے ہلکے ہلکے روں میں جھول رہا تھا میں نے اُسے دو تین مرتبہ چوما اور آگے بڑھ گیا۔

اتحاد۔ رشید۔ اختر اور خدا جانے کس کس کے کمرے کے آگے سے گزرتا ہوا میں ایک کمرے کے سامنے رُک گیا

اس میں میرا ایک گہرا دوست رہتا تھا۔ کتنا ہشاش بشاش! جب دیکھے خوش و خرم ہنسنے ہنسانے میں مشغول۔ ذرا ذرا سی بات پر فلک شکاف مقعے مقعے لگاتے میں مصروف۔ رنج اور افسردگی اس کے لئے کوئی مفہوم ہی نہ رکھتے تھے۔ مصائب اور حوادث اس کے لئے بے معنی چیزیں تھیں۔ وہ زندگی کے تمام مراحل سے خوش و خرم گزر جانا چاہتا تھا۔ زندگی اس کی نظروں میں لطف و تفریح کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہر شخص زندگی کی کڑی سے کڑی مصیبتوں کو ایک مسکراہٹ میں چُپا سکتا ہے۔ وہ خود ایسا کرتا تھا۔ میں نے بعض وقت اس کے مقہوں کی تہ میں بے چینی اور کشمکش کا ایک سیلاب دیکھا ہے۔ کبھی کبھی اس کی ہنسی مجھے کاٹ کھانے دوڑتی تھی مگر وہ ہمیشہ شاداں و فرحاں — اس کا کمرہ رات دن مقہوں سے گونجا کرتا تھا۔ اب بھی مجھے اس میں سے ہنسی کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک ہلکے سے ہنس کے ساتھ میں آگے بڑھ گیا۔

ارے! یہاں میں کیوں ٹھہر گیا؟ اس شخص سے مجھے سخت نفرت تھی۔ وہ ایک ہی وقت میں بڑا شریف اور چھٹا ہوا بدعاش تھا۔ ہر ایک کو دھوکہ میں رکھتا اس کی نظروں میں کمال۔ ایک دوسرے کو لڑا دینا اس کی فطرت۔ دوستوں کی چیزیں اُٹالینا اس کا شعار۔ باتیں کیجئے تو ایسا معلوم ہو کہ دوستوں کے لئے جان تک قربان کر دینے پر تیار لیکن وقت پڑے تو سیدھے منہ بات کرنے سے بھی عار۔

”پہلوان“ کے کمرے کے آگے سے گزرتے ہوئے میں نے جھلملیوں میں سے جھانکا۔ ہر روز صبح ناشتہ کے لئے جاتے ہوئے یہ میرا معمول تھا۔ میرا یہ دوست چھ فٹ سے بھی اونچا بڑا قوی پہلک تھا۔ ہم اسی مناسبت سے اسے پہلوان پہلوان بکا پکا کرتے تھے۔ ہر لڑکا آپ سے جو کتا رہتا اور پھر مولنا جو بنانے میں کمال رکھتے تھے۔ دعوتوں کے شکار پھانسنے میں انتہائی چالاک جس پر ڈورے ڈالنے شروع کر دے اُسے دعوت دیتے ہی بنی۔ میں چونکہ اکثر انھیں کچھ نہ کچھ کھلا دیا کرتا تھا اس لئے مجھے چھوڑ کر کسی دعوت میں شریک نہ ہوتے تھے۔

بیکلہ کی سیڑھیاں اترتے تو نجلی منزل میں سب سے پہلے رنعت کا کمرہ ملا۔ وہ ہمارے ہاسٹل کا مقبول شاعر تھا۔ اس کے کمرے میں اکثر لڑکوں کا جھگڑا رہتا۔ دو دو تین تین گھنٹہ مسلسل ہم اسے چھوڑتے نہ تھے۔ وہ سماج کے موجودہ نظام کی سخت بیزار تھا۔ اور سرمایہ داری کا بے انتہا مخالف۔ اس کی فکر و عمل میں یکسر غلی تھی۔ وہ اور شاعروں کی طرح کتا کچھ اور کتا کچھ رہتا گورا چٹا۔ منحنی۔ کھد پوٹ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گناہوں کے بوجھ سے بالکل خالی — انسان نہیں ایک فرشتہ ہے۔ جب ہی تو ہم میں کا ہر ایک اس کی تعلیم کرتا تھا۔

کئی کمرے پار کر کے میں رُک گیا۔ یہ میرے ایک فلسفی دوست کا کمرہ تھا۔ خطرناک حد تک سنجیدہ۔ جب دیکھے سوچتا ہوا۔ منا موثر۔ محو یا مطالعہ میں مشغول۔ بہت کم اپنے کمرے سے باہر نکلتا۔ اسے مسکراتا دیکھنے کی مجھے ہمیشہ آرزو رہی

چہرہ پر ہمیشہ تفکر کے آثار۔ سوچ بچار کا انداز۔ زندگی اور زندہ دلی نام کو نہیں۔ آخر آخر زمانہ میں تو اس کے چہرہ پر ایک عجیب پزیرم دگی چھائی ہوئی رہتی تھی۔ کالج چھوڑنے سے چند دن پہلے اس نے مجھ سے عشق و محبت پر بحث کی تھی اور بحث بھی کیوں کہوں؟ اس نے اپنے نظریے پیش کئے تھے۔ میں بھلا اس سے کیا بحث کر سکتا؟ اچھے اچھے پروفیسر اس سے ٹکر نہ لے سکتے تھے۔ اتنی قابلیت اور ذہانت کا آدمی میں نے کم دیکھا ہے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے جو بہا جلا جا رہا ہے۔ لیکن کجخت خاموش بہت رہتا تھا۔ نہ معلوم یہ روگ اسے کیوں لگ گیا تھا؟ اب مجھے افسوس ہوتا ہے کہ اس کی صحبت سے میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ مجھ سے اس کے کمرے کے آگے ٹھہرا نہ گیا۔ اپنے آپ میں نے حسرت اور مایوسی کی فضا میں کھڑا ہوا پایا۔ خاموشی سے سیڑھیاں اتر کر آگے بڑھا۔ اور بلا کچھ سوچے مجھے کرکٹ فیلڈ پر سے گزرنے لگا (Pitch) بیچ کے قریب پہنچا تو رُک گیا۔ اپنے ارد گرد میں نے ایک نگاہ دوڑائی۔ ہر طرف سکوت ہی سکوت۔ سناٹا ہی سناٹا طاری تھا۔ کوئی مقابلہ ہوتا تو چاہے جیٹی ملتی یا دلتی میں ضرور کھیل دیکھنے آجاتا۔ یہی ایک تو میری دلچسپی کا کھیل ہے۔ میدان دیکھ کر میرے دل میں ایک گدگد سی سی پیدا ہوئی۔ قریب ہی چند چھوٹے چھوٹے پتھر پڑے ہوئے نظر آئے۔ میں نے انھیں اٹھا کر گیند اندازی شروع کی۔ پہلے ہی پتھر پر حبیب سے بنی گریڈی بجا رہا بیچ پتھر پھینک کر میں نے نہانے کے حوض کا رخ کیا۔ یہاں بیٹھ کر میں نے بنی بجائی شروع کی۔ خوب چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ صاف شفاف پانی کی چھوٹی چھوٹی لہروں کے جزر و مد اور بنی کے اُتار بڑھاؤ نے ایک عجیب سماں پیدا کر دیا۔ نہ جانے میں کب تک اسی طرح محو رہا۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے جھنجھوٹا۔ رات کی خاموشی میں سائیں سائیں کی آوازوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہاں کتنی گڑ بڑ رہتی تھی؟ کتنی چل پھل؟ اس ہنگامہ کے بجائے یہ نموشی۔ اُف! تو بہ! مجھے تو وحشت سی ہونے لگی۔ میں وہاں ٹھہر نہ سکا۔ آگے نکل گیا۔

فطرت کی رعنائیاں بے طرح دل لوٹ رہی تھیں۔ میں پھر ان دبستیوں میں کھو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس رات میں دیوانہ ہو جانے والا ہوں۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر۔ جاتے جاتے میں شہر کے قبرستان تک پہنچ گیا۔ ارے! یہ میں مُردوں کی بستی میں کیوں چلا آیا؟ ان آسودگانِ خاک سے مجھے کیا تعلق؟ مجھے تو آج رات فطرت کا حُسن لوٹنا ہے۔ میں پلٹنے والا ہی تھا کہ ایک خیال نے میرے قدم روک لئے۔ ”جب یہاں تک آئے ہو تو اپنے پروفیسر کی قبر تک نہ جاؤ گے؟“ میں نے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”نہیں مجھے جانا چاہئے۔“ میری آواز نے ہوا میں ارتعاش پیدا کیا اور پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ اس دیرانہ میں میں اکیلا ہوں۔ دو چار قبروں پر سے ہوتا ہوا میں اس گوشہ کی طرف بڑھنے لگا جہاں ایک مینہ قبل میں نے اپنے عزیز پروفیسر کو سپردِ خاک کیا تھا میں ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ وہ میرے والد کے دوستوں میں سے بھی تھے اور بچپن سے مجھے چاہتے تھے۔ ابھی میں ان کی قبر سے کچھ فاصلہ ہی پر تھا

کہ دور ایک قبر پر مجھے مفید سی گھڑی دکھائی دینے لگی اور پھر ————— انسانی شکل! میں ٹھٹکا اور وہیں کھڑا کھڑا رہ گیا۔ جب بہت دیر تک کوئی ہلچل نہ ہوئی تو میں نے جلد جلد قدم بڑھائے اور اس قبر کے سر پر کھڑا ہو گیا۔ میری موجودگی کا جب اُسے احساس تک نہ ہوا تو میں پریشان ہوا۔ قریب پہنچ کر میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ دفعتاً میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ————— میرا فلسفی دوست جس کا ایک مہینہ سے پتہ نہ تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے۔ اُسے جگانے کی خاطر لیکن وہ بالکل مرد تھے۔ برف کی طرح ٹھنڈے اور بے حس۔ ایک لمحہ میں انھوں نے مجھ سے دُنبیا کی سردہری کی داستان کہدی۔ میں جگر تھام کر بیٹھ گیا۔ کوئی بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میرا دماغ ماؤف سا ہو گیا۔ ————— جب میں اٹھا ہوں اُس وقت سویرا ہو رہا تھا۔

ہوسٹل میں میں کب تک رہتا۔ میں نے گھر چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔ یہ دو تین دن عجیب حالت میں گزرے مجھے اپنے دوست کی موت کا بے انتہا غم تھا۔ گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ کوئی چار روز ہوئے میرے نام ایک پارسل آیا ہوا رکھا ہے۔ میں فوراً اپنے کمرہ پر پہنچا اور جلد جلد اُسے کھولنے لگا۔ ————— ایک خط اور ایک کتاب ————— کتاب میں نے میز پر رکھ دی اور خط پڑھنے لگا۔

پیارے دوست!

تم یقیناً خفا ہو گے کہ ہوسٹل چھوڑ کر میں یکا یک چل دیا اور تمہیں بھی اس کی اطلاع نہ دی کہ کیوں اور کہاں جا رہا ہوں؟

میری زندگی کی ٹریجڈی طویل ہے۔ مختصر ا یوں سمجھ لو کہ زندگی میں ایک مرتبہ میں نے اپنے خالق کو دیکھا۔ میں اس کی بارگاہ سے بہت دور تھا لیکن میری روح برابر اس کی پرستش کر رہی تھی۔ میں دوری ہی میں قرب کے مزے لوٹنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ مادی جسم مادیت ہی چاہتا ہے۔ روح کو اُسی وقت سکون ہوتا ہے جب اس مادیت کو قوت دار آجائے۔ میں نے اُسے پانے کے لئے نہیں بلکہ کبھی کبھی دیکھ لینے کے لئے ہوسٹل کو خیر باد کہ دیا۔ دیوانہ دار میں مرکز کی جانب کھنچا جا رہا تھا کہ معلوم ہوا سماج کے ظالم ہاتھوں نے اس کی زندگی کا دیا بھجا دیا۔ کیوں؟ اور کیسے؟ بہت طویل ہے۔ لفظ ”سماج“ اس کی تشریح کرے گا۔

میں نے اپنی زندگی کو ٹریجڈی اس لئے لکھا کہ دنیا کی نظر میں میں ناکام محض ہوں حالانکہ میری اپنی دانست میں مجھ سے زیادہ کامیاب اور کوئی نہیں۔

ایک مقدس تحفہ تمہیں بھیج رہا ہوں۔ میری زندگی کی واحد نشانی ہے۔ میں نے اسے اُس بارگاہ سے حاصل کیا

جہاں میری روح اپنے خالق سے متصل ہوتی تھی — لوگ صرف پیدا کرنے والے کو خالق سمجھتے ہیں لیکن میری نظر میں خالق وہ ہے جو زندگی کے کسی لمحہ میں بھی یہ سمجھا دے کہ زندگی کیا ہے؟ وہ خالق ہی کیا جو زندگی کے دوراے پر فنا کی گودی میں ڈھکیل دے۔ خالق تو وہ ہے جو حیات ابدی کا راستہ دکھلائے۔

کہاں ہوں؟ کیا کرتا ہوں؟ اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم سمجھتے ہو گے کہ میرا ٹھکانا کونسا ہے؟
تمہارا خالد

ابھمنوں کا پردہ میری نظروں سے ہٹ گیا — زندگی کی نیرنگیاں — ایک ٹھنڈی آہ کیساتھ میں نے سرادپر کو اٹھایا۔ سنہری جلد کی ایک خوبصورت کتاب ان سارے حوادث سے بے نیاز میر پر پڑی ہوئی تھی۔ میرے دوست کا آخری تحفہ — مجھ سے بڑھ کر اس کا حقدار اور کون ہو سکتا تھا؟

سید شاہ بلخ الدین حسین

متعلم سال دوم۔ ورنگل کالج

اقبال کا تصور خودی

اقبال کی شاعری کا وہ خاص پہلو جس نے اُس کو نہ صرف اپنے ہم عصروں بلکہ اگلے پچھلے تمام شاعروں میں ممتاز بنا دیا۔ اس کا تصور خودی ہے۔

خودی کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اول ”خود و تکبر“ کہ اگر خدا کے مقابلہ میں ہو تو انسان کو دائرہ عبودیت سے خارج کرتا ہے۔

دوسرے خودی بمعنی احساس ہستی غیر اللہ یا تعینات جن کا خالق قلب انسان کو کہا جاسکتا ہے صوفیائے کرام اور مہربان اکی ضرب ”لا الہ“ سے اُس کی نفی کر کے واصل ”الی اللہ“ ہوتے ہیں۔

ایرانی اور ہندی شعراء نے ان خیالات کو بڑی خوبی اور قلبی گہرائیوں کے ساتھ بیان کیا ہے حضرت شمس تبریز کہتے ہیں۔

چو تدبیر اے مسلماناں کہ من خود را نمیدانم نہ ترساو یهودی ام نہ گبرم نے مسلمانم
نہ از خاکم نہ از بادم نہ از آہم نہ از آتش نہ از ملک عراقی ام نہ از خاک خراسانم

اس قسم کے مضامین کی بڑی وجہ ہمارے خیال میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کی شاعری کا عروج حکومتوں کے تنزل، طوائف المملوکی عام قنوطیت یا عیش پرست اور غیر ذمہ دار حکمرانوں کے دور حکومت میں ہوا۔ ایسے وقت میں حاکم و محکوم، راجہ اور پر جاسب کے سب بالعموم ویدانت یا تصوف اور سلسلہ وحدت الوجود سے قریب تر ہو جاتے ہیں۔ اور یاس و حرماں کی منڈلاتی ہوئی بدلیاں جب ہر چار طرف سے قوم کو گھیر لیتی ہیں تو بقول اقبال مرحوم عیش پرست اور ذمہ داریوں سے گھبرانے والی قوم اس مصروفانہ شاعری کو اپنا فلسفہ حیات بنا لیتی ہے۔ ”میر کا جبریت تخیل ملاحظہ ہو۔“

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی چاہتے ہیں سو آپ کریں میں ہکو عیث بدنام کیا
 یوں کے سپید دیاہ میں ہکو دخل چوہ سو اتنا ہے رات کو درد صبح کیا اور دن کو جوتن شام کیا
 یہ اور اسی قسم کے ہزاروں اشعار اپنے دور کی حرماں نصیبی اور مایوسی کی ترجمانی کر رہے ہیں جبکہ قوم شاہراہ ترقی
 سے نہ صرف ہٹ گئی تھی بلکہ ترقی کے نام اور قومی زندگی کے تھمیل کو قطعاً بھول گئی تھی۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ جس طرح ہر کمال کو زوال لازم آتا ہے اسی طرح ہر زوال اعادۂ کمال کو دعوت دیتا ہے۔ انتہائی
 مایوسی اور المانکی کے دور میں بھی افراد قوم کے دماغ فلسفیانہ تھمیل سے بالکل خالی نہیں ہو جاتے چنانچہ نمبر جن کے
 جہر یہ عقیدے کے اشعار ابھی پیش کئے جا چکے ہیں ایک موقع پر روحانی ارتقا اور کسب کمال کی کیفیت عجیب لطیف
 پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔ ۷

جا کے پوچھا جو میں یہ کارگرہ میں نایں دل کی صورت کا بھی اے شیشہ گراں ہے شیشہ
 کہنے لاگے کہ کدھر پھرتا ہے برکا اے مست جس قدر بھی کہ تو دیکھے ہے یہاں ہے شیشہ
 دل ہی سا اے تھے یہ اک در تھیں کر کے گداز شکل شیشہ کی بنائی ہے کہاں ہے شیشہ
 پھنچا جو آپ کو تو میں پھنچا خدا کے تئیں معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا میر درد
 غالب اگرچہ ہمہ اوست کا قائل ہو کر کہتا ہے لیکن شعر سے احساس خودی کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ ۷
 قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے، دریا لیکن ہم کو منظور تنگ ظرفی، منصور نہیں

حقیقت یہ ہے کہ لفظ خودی کا استعمال اور اس کا مستقل احساس جو اقبال کو ہوا وہ نتیجہ ہے ملک اور قوم
 ملت کے اُس درد اور احساس کا جو مولانا آزاد، حالی، اسماعیل میرٹھی اور شبلی وغیرہ سے منتقل ہو کر اقبال تک پہنچا
 جس کے وجود باوجود نے ایک حد تک اُس کو مکمل کر کے اور عمل ہدایت بنا کر چھوڑا۔ اور ارباب فکر و نظر نے
 پیامبر کے معرّز لقب سے اس کو ملقب کیا۔ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس نے وحدت الوجود کے عام تھمیل اور
 اس قسم کی تصوّفانہ شاعری کے خلاف، جو قوم کو تھپک تھپک کر سلا رہی تھی جہادِ عظیم کیا ہے۔

اسرا خودی کے دیباچوں میں خود فرماتے ہیں ”یہ وحدتِ وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی جذبات
 تخیلات مستیز ہوتے ہیں۔ یہ پُر اسرار شے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔ یہ ”خودی“ یا
 ”انا“ یا ”میں“ جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمحل ہے۔ جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی
 لطافت ہنگاموں کے گرم مشاہدہ کی تاب نہیں لاسکتی کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض
 عارضی طور پر اپنے فوری علی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریبِ تخیل یا دروغِ مصلحت آمیز میں نمایاں

کیا ہے ؟

اخلاقی اعتبار سے افراد اور اقوام کا طرز عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے علماء اور حکماء نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کیلئے دماغ سوزی نہ کی ہو۔ مگر اس سوال کا جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا جس قدر کہ ان کی اُفتاد طبیعت پر۔

مشرقی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اس نتیجہ کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی ”انا“ محض ایک فریب تخیل ہے اور اس پھندے کو کھلنے سے اُتارنے کا نام نجات ہے۔ مغربی اقوام کا عملی مذاق اُن کو ایسے نتائج کی طرف لیگیا جن کے لئے اُن کی فطرت متقاضی تھی۔ مغربی ایشیائیں اسلامی تحریک ایک نہایت زبردست پیغام عمل تھی۔ گو اس تحریک کے نزدیک ”انا“ ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے لا روال ہو سکتی ہے۔ میں نے اس مسئلہ کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس حقیقت کو سمجھنے اور اس پر غور کرنے میں آسانی ہو۔“

خودی کا یہ مفہوم جو بالا جمال اقبال کے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے اُسے خود اقبال کے شعروں سے سمجھئے۔

اقبال کا تصور خودی ہمارے خیال میں وہ خود داری اور خود اعتمادی ہے جو خود شناسی کے توسط سے خدا شناسی کی منزل پر پہنچاتا ہے اور بتاتا ہے کہ شاعری کا اصل مقصد قوم کی حالت کا احساس اور اس میں روح زندگی پیدا کرنا ہے کہتا ہے کہ

مشرق کے خیستار میں ہے محتاجِ نفس نئے شاعر ترے سینہ میں نفس ہے کہ نہیں ہے
وہ خیال کرتا ہے کہ جو قوم محکومی اور غلامی میں پڑ کر احساس خود داری کو کھو بیٹھتی ہے اُس کے حق میں عجمی شاعری (مستوفانہ شاعری) نہایت زبوں ہے۔

تاثر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اجہی نہیں اُس قوم کے حق میں عجمی نے
ہے شعر عجم گر چہ طرب ناک و دلا ویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز
ظاہر ہے کہ وہ ایسی شاعری کو ہرگز پسند نہیں کرتا جس میں جذباتی اُبھار، روح زندگی اور خود داری گھٹیں لگتی ہو۔

اقبال پیر تربیت کی خدمت میں جا کر بھی فنائیت کی معروف عام تعلیم حاصل کرنا نہیں چاہتا نہ اُس کے فیض صحبت اور تصرفِ نظر سے گراماتی جھلک کا اکتساب کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ وہ قلندرِ ”انا“ کا متوالا کر امت محسم بننا چاہتا ہے

اُس کا عقیدہ ہے۔

ہندو زندگی میں ابتدا، انتہا، الہام موت کو جب لاہوا الہ سے بیگانہ
چاند اور ستارے قدرت کی روشن نشانیاں ہیں۔ وہ اُن پر ایک ابراہیمی نظر ڈالتا اور انسانی خودی دھڑکنے والی
غور اور خلیفۃ الہی کے ظاہری لوازم کو ہیج و پوچ خیال کر کے یوں کہتا ہے
مہ دستارہ مثال شرارہ یک دو نفس سے خودی کا بد تک سرور رہتا ہے
اقبال اپنے عقیدہ خودی میں مشرقی پیرہستی اور مغربی دہریت دونوں کو ناپسند کرتا ہے۔
اقبال جس کا فلسفہ خودی مولانا روم کے خیالات سے ملکتا ہے یہ بانگ دہل کہتا ہے مولانا رومیؒ
اے بسا ابلیس آدم روئے ہست پس بہر دستے نشاید داد دست
حقیقت یہ ہے کہ سلسلہ طریقت جس پر تعلیم روحانیت اور تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کا بڑا دار و مدار ہے۔ اُس میں
اکثر و بیشتر کو تقلید کی پرورش ایسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ دہریت میں کو رباطی اور نفس پرستی کی۔ اور اقبال کے تصور
خودی کو یہ دونوں صورتیں سخت مجروح کرتی ہیں۔ چنانچہ کہتا ہے۔

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے سود خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے بروج عرب ہے تب تاب بدن عراق و عجم کا ہے بے عروتی عظام
خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

ہندوستان کے جن حصوں میں پیرہستی اور اداہم پرستی کا زیادہ رواج ہے اُن میں پنجاب بھی شامل ہے۔ چنانچہ
پنجابی مسلمان کے پرے میں عام پیری مریدی کی مذمت اسی کو تقلیدی اور خود فروری کی بنا پر کرتے ہوئے بدعات و تلون
ارادت کی طرف بھی اچھٹا سا اشارہ کر جاتا ہے۔

مذہب میں بہت تازہ پسند اُس کی طبیعت کر کے کیس منزل تو گزرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شکر نہیں کرتا ہو کھیل مریدی کا تو ہر تار ہے بہت جلد
تاویل کا پھندا کوئی صیبا لگا دے یہ شاخ نشین سے اترتا ہے بہت جلد

فلسفی اور سائنسدان جو اپنی تحقیق و تجرید پر نازاں اور بخود غلط ہو کر خودی اور خدا دونوں کو بھول جاتے ہیں یا بعض
محققان نجوم شاہینِ عمل کے پرہیز و توڑ بیٹھتے ہیں۔ اقبال کو اپنی رُخِ خودی اور راہ معرفت داگہی میں دوڑے نظر آتے
ہیں۔ کہتا ہے۔

نظر سپہر پر رکھتا ہے جو ستارہ شناس نہیں ہے اپنی خودی کے مقام سے آگاہ

خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا وہی ہے مملکتِ صبح و شام سے آگاہ
 غرض اقبال کا تصورِ خودی وہ عجیب، مفید اور لطیف خیال ہے جو علمی تکبر و خود بینی سے پاک، پیر پستی اور دہریت
 کی کو تقلیدی اور کو باطنی سے بہرہ ور نہ کر خود شناسی سے خدا شناسی کی طرف لیجانے والا اور کامل انسانیت کی طرف
 رہنمائی کرتے ہوئے حیاتِ انسانی میں ایک تازہ روح پھونک دینے والا فلسفہ ہے۔ وہ بطور قولِ فیصلِ کتاب ہے
 خودی کی تربیت و پرورش پہ ہے موقوف کہ مشیتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز
 خودی کو کہ بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندہ سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
 اقبال کے دماغ کا نقطہٴ احساس، جو ہر انسانیت اور خودی کی پرورش ہے جو آخر زمان میں اُس کی شاعری کا مستقل
 موضوع بن گئی۔ وہ نہ کوئی فرضی اور نہ گھڑت چیز ہے نہ شاعرانہ تعلق ہے اور نہ کسی الامام اور نزولِ وحی کا نتیجہ ہے بلکہ
 وہ ایک مخصوص شاعرانہ کردار ہے جو ہر اُس شاعر کے اندر پیدا ہونا چاہئے تھا جس کو قدرت نے اقبال کا سادھنِ رسا
 جو ہر لطیف، علمی، تجربہ فلسفیانہ دماغ اور مطالعہ کائنات کا ایسا صحیح ذوق اور در دہرادل عطا فرما کر اُس فضا میں پیدا
 کیا ہوتا جس میں حالی اور اسماعیل میرٹھی کے مسدس اور مثنوی آثارِ سلف کی صدا میں گونج رہی تھیں

محمد سمیع الزماں

درنگل کالج

گمشدہ لعل

رائے چرن کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی کہ دوزخِ شکم نے نوکری پر مجبور کر دیا۔ اتفاق سے اس کو ایک ایسا گھر مل گیا جہاں اُس کو انکول نامی ایک چھوٹے بچہ کے کھلانے پر نوکر رکھ لیا گیا۔

زمانہ گزرتا گیا۔ بچہ خاصہ بڑا ہو گیا۔ ادرا ب اسکول جانے کیلئے بھی رائے چرن کا حاحہ بند نہ رہا۔ اسکول کی تعلیم کے بعد انکول کالج میں داخل کر دیا گیا۔ اور تعلیم ختم کرنے کے بعد عدالت میں ملازم بھی ہو گیا۔ مگر شادی کے وقت تک رائے چرن اُس کا خادم رہا۔

شادی کے بعد رائے چرن کو بجائے ایک کے دو کی خدمت کرنی پڑی۔ اب اس کی توجہ زیادہ تر نئی گھر والی کی طرف ہوتی تھی۔ خدا نے اس کو بیادیا اور رائے چرن کی خوش طبعی سے وہ اس سے ہل گیا۔ کبھی وہ اُسے اچھا لگتا تھا۔ کبھی اس سے بچوں کی بے معنی زبان میں باتیں کرتا۔ کبھی منہ اس کے چہرہ کے قریب لیجاتا اور قمقمہ کے ساتھ پیچھے ہٹا لیتا۔ رفتہ رفتہ بچہ گھٹنیوں چلنے لگا۔ اکثر گھر کے دروازے سے باہر بھی نکل جاتا۔ رائے چرن اس کو پکڑنے جاتا تو وہ خوش ہو ہو کر ادھر ادھر بھاگتا۔ اور بچکر نکلنے کی کوشش کرتا۔ جس طرف سے رائے چرن کو آتا دیکھتا فوراً ادھر سے رخ بدل دیتا اکثر رائے چرن اس کی ماں سے کہا کرتا تھا ”آپ کا لڑکا بڑا ہو کر بچ بنے گا۔“

زمانہ گزرتا گیا اور انقلاب ہوتے رہے۔ رائے چرن کو بھی ایک مسرت آمیز زندگی حاصل ہوئی جب بچے نے چلنا اور بولنا سیکھا۔ جب وہ تھلا کر اپنے ماں باپ اور رائے چرن کو پکارتا تو رائے چرن خوشی سے دیوانہ ہو جاتا کرتا تھا۔ کبھی وہ خود گھوڑا بنتا منہ میں ”لگام“ لے لیتا اور بچے کو اپنی پیٹھ پر سوار کر لیتا۔ کبھی اُس کے ساتھ کشتی لڑتا اور اگر اپنی چالاکی سے چت نہ ہو جاتا تو سارے گھر میں شور مچ جاتا۔

اسی زمانہ میں انکول کا تبادلہ پدماندی کے کنارے کسی ضلع پر ہو گیا۔ وہ کلکتہ سے بیٹے کے لئے زردوزی داکٹ اور ٹوپی اور سونے کے کڑے لایا۔ رائے چرن یہ چیزیں پہنا کر اس کو باہر لیجا یا کرتا تھا۔

سادن کا مینہ تھا۔ مینہ کی جھڑیاں لگی تھیں۔ بھوکی ندی بڑی ناگن بن کر کئی گاؤں مضم کر چکی تھی۔ ندی کے لگاتار دھارے کی آواز دور دور تک جاتی تھی۔ جھاگ کے بڑے بڑے انبار ندی کی رو کے ساتھ بہہ چلے جاتے تھے۔

شام کا وقت تھا۔ بارش رُکی تھی مگر آسمان ابرا آلود تھا۔ ہوا میں خنکی تھی۔ یہ دلکش سماں انکول کے بیٹے کو باہر نکلنے پر مجبور کرنے کے لئے کافی تھا۔ وہ اپنی گاڑی پر چڑھ بیٹھا۔ رائے چرن خود باہر نکلنا چاہ رہا تھا۔ اُسے ندی کے کنارے لے گیا مگر وہاں خاموشی کی حکمرانی نظر آئی۔ کامل خاموشی! نہ دھان کے کھیتوں میں کوئی کسان ہی نظر پڑا نہ ندی میں کوئی کشتی ہی نظر آئی البتہ ندی کے دوسرے کنارے پر بادل چھائے ہوئے تھے جن میں سے کبھی کبھی سورج کا شرمیلا چہرہ نظر آ جاتا تھا۔ آخر اس طلسم سکوت کو بچنے نے انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے اس طرح توڑا

”آہا چُٹا!! پول!!“

رائے چرن نے دیکھا تو قریب ہی ایک پودے پر خوبصورت پھول لدے ہوئے تھے۔ پتھر پھولوں کو للچائی ہوئی نکاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ مگر رائے چرن نے کپڑے میں جا کر پھول لانا مناسب نہ سمجھا اور دھیان بٹانے کے لئے کہا ”دیکھو دیکھو! پڑیا! اہا کیسی اچھی چڑیا!!“ مگر بڑا ہو کر جج بننے والا بچہ اس کی اڑان گھائیوں میں کہاں آنے والا تھا! اس کے دل میں سما گئی تھی۔ آخر جب مجبور ہو گیا تو رائے چرن نے کہا ”اچھا تم ہمیں ٹھیرو میں پھول توڑ کر لاتا ہوں۔ مگر دیکھو پانی کے پاس مت جانا۔“ اس نے دھوئی کس لی اور کپڑے کی طرف چلنے لگا۔

لیکن رائے چرن کے جاتے ہی بچے کے خیالات پانی کی طرف منتقل ہو گئے۔ ندی کی لہروں کو دیکھ کر اس کا دل خوشی سے موجزن ہو گیا۔ وہ گاڑی پر سے اُترا اور ندی کی طرف چلنے لگا۔ تھوڑی دور جا کر اس نے ایک چھوٹی سی لکڑی اٹھائی شاید مچھلیاں پکڑنے کے لئے ندی کی شوخ لہریں اس کو اپنے ساتھ کھیلنے کی دعوت دے رہی تھیں۔

رائے چرن نے مٹی بھر پھول توڑے اور قمیص کے دامن میں رکھ کر خوش خوش واپس ہوا۔ مگر جب گاڑی کے پاس پہنچا تو بچہ کو وہاں نہ پایا۔ چاروں طرف نظر دوڑائی اور بار بار گاڑی کو دیکھا۔ مگر بچہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ رائے چرن کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی اس کی انگلیوں میں ساری دنیا تاریک ہو گئی۔ آخر کار اپنے ٹوٹے ہوئے دل کی گہرائیوں سے اس نے پتھر کو پکارنا شروع کیا۔ مگر کسی نے اس کے جواب میں ”چُٹا“ نہیں کہا۔ کوئی شوخ بچہ پیچھے سے آکر نہیں ہنسا۔ صرف ندی اپنے غیر شعورانہ ”گرہہ تبسم“ میں مصروف تھی۔

اندھیرا چھا رہا تھا۔ اور رائے چرن ابھی گھر واپس نہ ہوا تھا۔ انکول کی بیوی بہت فکر مند ہوئی۔ اس نے رائے چرن کی تلاش میں لوگوں کو بھیجا۔ وہ لائین لئے اُس کی تلاش کو نبھلے اور آخر کار پدما کے کنارے بھی پہنچ گئے۔ وہاں پہنچے تو

رائے چرن کو بدحواسی کے عالم میں ادھر ادھر پھرتے اور بچے کو بھارتے ہوئے دیکھا۔
آخر کار جب رائے چرن کو گھر لایا گیا تو وہ آتے ہی بچے کی ماں کے قدموں پر گر گیا۔ اُس نے اٹھا کر پوچھنا چاہا مگر
رائے چرن نے ”مجھے نہیں معلوم“ کے سوا کوئی جواب نہ دیا۔

گو سب کو یقین تھا کہ بچہ ندی میں ڈوب گیا۔ مگر پھر بھی کچھ شبہ باقی تھا کیونکہ لٹیروں کا ایک گروہ اس دن شہر میں
داخل ہوا تھا اور اُن پر شبہ جاتا تھا۔ بچہ کی ماں پر رنج و غم کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے خود رائے چرن کو مٹہ بٹھیرایا۔ اور
انتہائی یاس اور حیران لہجہ میں کہنے لگی۔ ”رائے چرن میرے پیارے بچہ کو واپس دیدے۔ مجھ سے جتنی چاہے دوات لیلے
مگر میرے بچہ کو دیدے۔“ رائے چرن نے اس کا جواب سینہ کو پی سے دیا۔ مگر انکول کی بیوی سے فصہ مضبوط ہو سکا اور اس
نے رائے چرن کو نکال دیا۔

انکول نے بیوی کو سمجھایا۔ ”نہیں رائے چرن ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔“
”اشیو جانے! بیوی نے جواب دیا۔ ”بچہ سونے کے کڑے پہنے ہوئے تھا۔“

(۳)

رائے چرن اپنے وطن کو چلا گیا۔ اُس کے کوئی اولاد نہ تھی اور نہ آگے ہونے کی توقع۔ مگر قدرت کو منظور ہو تو کیا نہیں
ہو سکتا۔ ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ اُس کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ مگر بیوی بچے کی پرورش کے لئے زندہ نہ رہی۔
بیٹے کی پیدائش سے رائے چرن کو بجائے خوشی کے رنج ہوا۔ وہ سوچا کرتا کہ بچہ اُس کے دل سے انکول کے بیٹے کی
محبت بٹھالنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ”نچھے آقا“ کی موت کے بعد اپنے بیٹے کو دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا
یہ چارہ بچہ اگر بچھو پھی کے سایہ میں نہ رہتا تو کبھی کا چل بسا ہوتا۔

زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس کا بیٹا بھی گھٹنیں چلنے لگا۔ وہ بھی انکول کے بیٹے کی طرح گھر سے باہر نکل جایا کرتا تھا۔ اس
کی آواز، اس کی ہنسی، اس کا ردنا بالکل انکول کے بیٹے کا سا ہوتا تھا۔ جب کبھی وہ روتا تو رائے چرن کو بہت صدمہ ہوتا
اسے ایسا معلوم ہوتا کہ اس کا ”نچھا آقا“ اپنے چٹا کو چھوڑ کر عدم کی دنیا میں رو رہا ہے۔

کچھ دن اسی حالت میں گزر گئے۔ اب رائے چرن کا بیٹا (فائلن) چلنے لگا تھا۔ وہ بھی جب اپنی پیاری زبان سے
رائے چرن اور اپنی بھوپھی کو پکارتا تو رائے چرن اس کو خوب پیار کرتا اور اکثر اپنے دل میں سوچا کرتا کہ انکول کے بیٹے نے
اپنے چٹا کی جدائی برداشت نہیں کی اور دوبارہ دنیا میں آیا ہے۔ روز بروز اس کا یہ خیال بجھتا ہوتا جاتا تھا۔ اور اس نے
اس کی تین وجہیں بھی اپنے ذہن میں قائم کر لی تھیں۔ اول تو یہ کہ فائلن پہلے بچہ کی موت کے ایک سال بعد ہی پیدا ہوا ہے
دوسرے یہ کہ اب اس کو اولاد کی امید بھی نہ تھی اور تیسرے یہ کہ فائلن کی تمام حرکات و سکنات ہو ہوا انکول کے بیٹے

کی سی تھیں۔

رہے چرن کو جب انکول کی بیوی کا خیال آتا تو وہ اپنے دل سے کہتا: ”آہ! وہ سچ کہتی تھی میں نے ہی اس کے تخت جگہ کو چڑھایا ہے۔“

اب اس نے بیٹے کے لئے اپنا مال، جان سب کچھ وقف کر دیا۔ اور اس کا خدمتگار بن گیا۔ اس کے لئے اچھی اچھی چیزیں لایا کرتا۔ کام دار ٹوپی لایا۔ بیوی کا زیور تڑوا کر اس کے لئے کرے بنوائے۔ جب پچھڑا ہوا تو اس کی تعلیم کی فکر دامنگیر ہوئی۔ رہے چرن اپنی زمین بیچ کر کلکتہ چلا گیا۔ جہاں اس کو بڑی دقت سے نوکری ملی۔ اس طرح فائلٹا کی تعلیم کے مصارف برداشت کرنے کے قابل ہوا تو اس کو اسکول میں داخل کر دیا۔

اب وہ اس کو بہت اچھی طرح رکھا کرتا تھا۔ اس کو اچھے اچھے کپڑے پہناتا۔ اچھے اچھے کھانے کھلاتا۔ خود کبھی کبھی فاتحے بھی کر جاتا مگر فائلٹا کے لئے کوئی کمی نہ کرتا اور تنہائی میں کہا کرتا: ”تم نے مجھ سے اتنی محبت کی کہ مرنے کے بعد بھی مجھے نہ چھوڑا۔ اب تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔“

اس طرح بارہ سال گزر گئے۔ فائلٹا اب بخوبی لکھ پڑھ سکتا تھا۔ وہ بہت تندرست اور خوبصورت تھا۔ راجہ اپنی فرصت کا سارا وقت اس کے سنگار میں صرف کر دیتا۔ اس کے لئے کبھی پیسہ کا منہ نہ کرتا بغرض اُس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا کہ فائلٹا باپ کو باپ نہ سمجھتا۔ ویسے بھی رہے چرن نے اس کو کبھی اپنا بیٹا نہ بتایا تھا۔

بورڈنگ ہاؤس کے لڑکے، جس میں فائلٹا رہتا تھا، رہے چرن کے دیہاتی لباس اور چال ڈھال کی ہنسی اُڑایا کرتے تھے۔ گوسائے نہیں۔ کبھی کبھی فائلٹا بھی اُن کے ساتھ شریک ہو جاتا تھا۔ لیکن اس کی سیدھی سادی طبیعت کی وجہ سے وہ اس کی بہت عزت کرتے تھے اور فائلٹا بھی اس سے محبت کرتا مگر مجبوری!

رہے چرن اب بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ اور اُس سے نوکری کا کام نہ چلتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی حالت بالکل خراب ہو گئی۔ حافظہ کام کا نہ رہا۔ صحت نے جواب دیدیا۔ اور بالآخر نوکری سے بھی جواب مل گیا۔ اس کس مہر سی کی حالت میں وہ بہت پریشان ہوا۔ چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی جس میں روشنی کی ہلکی سی کرن بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ آخر اس نے تھوڑی سی رقم فائلٹا کے پاس چھوڑی اور گھر جانے کے بہانے سے بیرسٹ گیا۔ جہاں انکول ججسٹریٹ تھا۔ انکول کے ابھی تک کوئی بچہ نہ ہوا تھا۔ اور اس کی بیوی اولاد سے بالکل مایوس ہو چکی تھی۔

(۴)

شام کا وقت تھا۔ انکول دن بھر کا تھکا ماندہ باہر صحن میں بیٹھا ہوا تھا کہ یکایک دستک کی آواز آئی۔ جا کر دیکھا تو رہے چرن کھڑا تھا۔ اپنے پرانے نوکر کو دیکھ کر انکول کا دل بیچ گیا۔ اس سے کچھ دیر تک باتیں کرتا رہا اور

آخر کو نوکر رکھنے پر بھی آمادہ ہو گیا۔ رائے چرن نے سُکراتے ہوئے اندر جانے کی اجازت چاہی۔ انکول رائے چرن کو اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ لیکن بیوی نے ایسی گرہ محو شوی نہیں برتی۔

”اے چرن نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔ ”لڑکے کو پدمانے نہیں پرایا۔ میں ہی تھا اُس کا چور!“
 ”ہیں!! کیا؟ پھر کہاں ہے وہ؟“ انکول نے انتہائی تعجب سے پوچھا۔
 ”میرے پاس پر رسول لیتا آؤں گا۔“ اے چرن نے جواب دیا۔

(5)

اتوار کا دن تھا مجھ ٹریٹ کے کورٹ کی تعطیل تھی۔ صبح سویرے سے میاں بیوی کی نظریں سڑک پر جمی ہوئی تھیں دس بجے کے قریب رائے چرن فالٹنا کے ساتھ آیا۔ انکول کی بیوی فالٹنا کو دیکھتے ہی بے تاب ہو گئی۔ بغیر شکل و شباہت کا خیال کئے اسے سینے سے چٹایا۔ اسے دیکھ کر کبھی منہتی، کبھی روتی، اور کبھی گھورتی۔

”ثبوت! اس کا کیا یہ وہی بچہ ہے۔“ انکول نے پوچھا۔

”ثبوت !! ایسی انوکھی بات کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔“ رائے چرن نے ہمت کر کے کہا۔

”ایشور جانتا ہے کہ میرے سوائے آپ کے بچہ کو کسی نے نہیں چھریا تھا۔“

جب انگول نے بیوی کو اس اشتیاق سے لپکے کو لیتے ہوئے دیکھا تو اس نے بھی ثبوت کو کچھ اہمیت نہ دی
 ”اس کی بات کا یقین کرنے میں کیا نقصان ہے“ انگول نے سوچا۔ ”اور پھر بڑے رائے چرن کو ایسا بچہ کہاں سے مل سکتا
 ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔“

مگر مجسٹریٹ بوڑھے نوکر کا نوکری چھوڑ کر چلا جانا بھولانہ تھا۔ حکم دیا۔ ”رائے چرن اب تمہارا اس گھر میں گزر رہی نہیں۔“

”کہاں جاؤں حضور!“ رائے چرن نے دبی آواز میں کہا۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ ”میں بوڑھا ہو گیا ہوں،“

”یہیں رہنے دو نا! میرا بچہ خوش رہے گا۔ میں نے معاف کر دیا۔“ بیوی نے کہا۔ مگر مجسٹریٹ اس کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔

”نہیں!“ انکول نے سختی سے کہا ”ایسے مجرم کو معاف نہیں کیا جاسکتا“

رائے چرن انکول کے قدموں پر گر پڑا۔ "حضور یہیں رہنے دو مجھے" اس نے رقت آمیز لہجے میں کہا "میں نے نہیں لیا تھا لڑکا۔ ایسور نے....."

انکول اور برہم ہو گیا جب رائے چرن نے ایشور پر الزام دھرا۔
 ”نہیں تم یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ تم نے دغا بازی کی ہے۔“ انکول نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا
 ”میں نے نہیں چڑایا“ رائے چرن نے پھر ہمت کر کے کہا۔
 ”پھر کون تھا وہ؟“ انکول نے سختی سے پوچھا۔
 ”میری قسمت“ رائے چرن نے جواب دیا۔

مگر انکول جیسے تعلیم یافتہ کے دماغ میں ”قسمت“ کے جواب نے جگہ نہ لی۔
 جب فالٹنا نے دیکھا کہ میں مجسٹریٹ کا بیٹا ہوں۔ مجھ کو اب تک دھوکہ میں رکھا گیا تو اسے بہت غصہ آیا۔ مگر جب
 رائے چرن کو مصیبت میں دیکھا تو کہنے لگا۔ ”معاف کر دیجئے اسے۔ اگر یہاں نہیں رہنے دیتے تو اس کے لئے ایک ماہارنیشن
 مقرر کر دیجئے۔“

یہ سنکر رائے چرن کی زبان بند ہو گئی۔ اس نے آخری مرتبہ حسرت بھری نگاہوں سے اپنے بیٹے کو دیکھا اور چلا گیا
 مہینہ کی آخری تاریخ کو انکول نے کچھ روپیہ اُس کے گاؤں کو بھیجے۔ مگر منی آرڈر واپس آ گیا۔ کیونکہ رائے چرن
 نامی شخص کا پتہ نہ چلا۔

(ترجمہ)

محمد فصیح الزماں قریشی

مستطعم جماعت دہم۔ ورنکل کالج

نکات

۱ دل میں ذوق امید پیدا کر آنکھ میں شوق دید پیدا کر
 ۲ جان کو نا صبوریاں سکھلا خوں ہل من مزید پیدا کر
 ۳ دل ملا وسعت نظر نہ ملی! شب ملی ساعت سحر نہ ملی
 ۴ اسیپ ساحل کی ہو رہی آکر اس کو جب دولت گم نہ ملی
 ۵ بیخبر وسعت نظر ہے بشر گل نہیں جو ہر بشر ہے بشر
 ۶ جلوہ کائنات بھی ہم سے کہ رہا ہے کہ دیدہ ور ہے بشر
 ۷ اے کف خاک! دیدہ ور ہو جا شب تاریک سے سحر ہو جا
 ۸ خود گری سہل ہے امین خزیں صاحب فکر و خود نگر ہو جا

امین خزیں سیالکوٹی

نوٹ:- گلبانگ حیات از امین خزیں سیالکوٹی اگست میں شائع ہو رہی ہے۔ اردو اکیڈمی لاہور سے دستیاب ہو سکے گی۔

غزل

پیمانہ پہلو کو لبریز وفا کر لے میخانہ ہستی کی یہ رسم ادا کر لے
 جینے کی حقیقت سے ممکن نہیں لگا ہی جلتکے رگِ جاں میں تو مشرِ پیا کر لے
 یا حزنِ غلط بکمرِ طصفیہ ہستی سے یا زیرِ نگیں اپنے یہ ارضِ سما کر لے
 ہر تیر نشانہ پر بیٹھے۔ نہیں بہ اچھا دوا یک دانستہ تو خود ہی خطا کر لے
 ایمان اگر محکم ہے شانِ کربی پہ تو بندہ مومن ہے صد بار خطا کر لے
 کانٹوں کو گلہ تجھ سے پھولوں کو شکوہ ہے سیر اس جہنمِ تال میں تو مثلِ صبا کر لے

✓ ہو جائیں ہیں دونوں خوش تجھ سے نہیں ممکن

دُنیا کو خفا کر لے یا ”اس کو“ خفا کر لے

امین خزیں سیالکوٹی

مملکت دکن کا معاشی مُطالعہ

حیدرآباد کے کسی معاشی مسئلہ پر بحث کرنے کے لئے ہمیں کوئی مستند کتاب نہیں ملتی جو خاص طور سے حیدرآباد کی معاشیات پر لکھی گئی ہو۔ البتہ مختلف محکمہ جات کی چھپی ہوئی رپورٹوں سے کچھ مواد اور کچھ اعداد و شمار مل جاتے ہیں۔ اس مضمون کی تیاری میں انیس رپورٹوں سے مدد لی گئی ہے۔

بقول جناب ایلاس برنی صاحب انسان زندگی کے ہر شعبہ میں بالآخر قدرت کا محتاج ہے اور خاص کر اس کی معاشی جدوجہد کا دار و مدار تو قدرتی حالات ہی پر ہے۔ اسی لئے کسی ملک کی معاشی حالت کا مطالعہ کرنے کے لئے سب سے پہلے اس ملک کی قدرتی یا طبعی حالت کا معلوم کرنا از بس ضروری ہے۔

ہندوستان کا نقشہ دیکھنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان قدرتی طور پر تین حصوں میں منقسم ہے شمال میں پہاڑی حصہ ہے جو کوہ ہمالیہ کہلاتا ہے۔ وسط میں میدانی حصہ ہے۔ اور جنوب میں وہ حصہ زمین ہے جو دکن کے نام سے موسوم ہے۔ ممالک محروسہ اسی علاقہ کے وسط میں واقع ہے۔ اس کے شمال میں برار اور صوبہ توتسٹا ہیں جنوب میں بلاری۔ کرنول اور کرشنا مشرق میں واردھا، کرشنا اور گوداوری۔ اس سے مس کرتے ہیں۔ مغرب میں بجاپور، شولا پور اور احمد نگر اس کی حد بندی کرتے ہیں۔

تمام ملک سطح مرتفع ہے۔ کہیں بھی سطح سمندر سے ایک ہزار دو سو پچاس (۱۲۵۰) فٹ سے کم بلند نہیں ہے زمین عموماً پتھر جلی ہے۔ زمین کا ڈھلوان شمال مغرب سے جنوب مشرق کی طرف ہے۔ اسی لئے ممالک محروسہ کے دریا اسی رخ بہتے ہیں۔ شمال مغربی حصہ جنوب مغربی حصہ سے بالکل مختلف ہے۔ شمال مغربی حصہ کی زمین سیاہ مٹی کی زمین ہے۔ اور جنوب مشرقی حصے کی سرخ ریتیلی۔ اول الذکر کو مرہٹواڑی کہتے ہیں۔ اور ثانی الذکر کو تلنگانہ۔

دواہم دریا جو ممالک محروسہ میں بہتا ہے گوداوری اور کرشنا ہیں۔ چونکہ یہ دریا کافی اونچائی سے نشیب کی طرف بہتے ہیں نیز زمین بھی پتھر جلی ہے اس لئے یہ دریا آب پاشی اور جہاز رانی کے لئے کلیتہً غیر موزوں

چاول یہاں کے جملہ باشندوں خصوصاً اہل تلنگانہ کی مرغوب غذا ہے۔ لیکن اس کے باوجود تلنگانہ صرف ۳ فیصدی حصہ اس کے زیر کاشت ہے۔ اس لئے چاول ہر سال بمقدار کثیر مدد اس اور صوبجات متوسط سے درآمد کیا جاتا ہے۔

نیشکر کی کاشت کے لئے بھی مخصوص موافق حالات یہاں موجود ہیں۔ نظام ساگر کی تکمیل کے بعد سے اس طرف خاص توجہ کی جا رہی ہے۔ نیشکر کی کاشت کے لئے بڑی آب و ہوا خشک موسم اور موافق برسات چاہئے۔ خط استوا سے قریب ہونے کی وجہ سے یہ سب باتیں ریاست حیدرآباد کو حاصل ہیں۔

حیدرآباد کے جنگلات بہت اہم اور قیمتی ہیں۔ ہر قسم کا چوبینہ یہاں دستیاب ہوتا ہے مثلاً پاکھال کے جنگلوں میں ساگوں۔ عادل آباد کے جنگلوں میں دیاسلانی کی لکڑی اور بانس وغیرہ۔ یہاں کے بانس کا گودہ کا غذائی کیلئے بہت مفید ہے۔ چنانچہ اس خصوص میں کوششیں بھی ہو رہی ہیں۔ یہاں کے جنگلات میں مہوہ کے درخت بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں جن کے پھولوں سے شراب کشید کی جاتی ہے۔ اس سے پٹرول سازی کے بھی قوی امکانات ہیں بہتر ہوتا کہ شراب سازی جیسے خراب اخلاق کام کے بجائے پٹرول سازی کی طرف توجہ کی جاتی۔ یہاں کے جنگلات میں قسم قسم کی جڑی بوٹیاں بھی موجود ہیں جن کی باضابطہ تحقیق کی جائے تو یہ امرطب کی ترقی کا موجب ہو سکتا ہے اور ہزار ہا روپیہ جو مختلف قسم کی دواؤں کے لئے باہر ملتا ہے وہ ملک ہی میں رہ سکتا ہے۔ یہاں کے جنگلات سے اصولی طور پر پوری طرح افادہ حاصل کیا جائے تو جنگلات کی موجودہ آمدنی میں دو گنا اضافہ ہو سکتا ہے۔

حال ہی میں یہ دریافت ہو ا ہے کہ راپچور کے دوا بہ میں سونے کے کافی ذخائر موجود ہیں چنانچہ ۱۳۸۸ء میں حکومت سرکار عالی نے ۸ لاکھ روپے اس کام کے لئے مختص کر دئے ہیں۔

سنگرینی میں کوسیلہ کی زبردست کانیں ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ سالانہ چار لاکھ ٹن کے حساب سے سنگرینی کی کانیں ایک سو بیس سال تک کے لئے کافی ہوں گی۔ یہ بھی معلوم کیا گیا ہے کہ سنگرینی کے قریب ہی چونے کی کانیں بھی موجود ہیں۔ کونلہ اور چونے کی کانوں کا قریب قریب پایا جانا صنعت آہن و فولاد کے لئے نہایت مفید ہے۔

ان کے علاوہ پتھر یا ل کے علاقہ میں تانبہ اور چینی مٹی۔ کھم مٹھ میں ابرک۔ حسن آباد اور پمپرتی میں گرافائٹ کے ذخائر بھی موجود ہیں۔ یلغڑپ، نرمل اور ورنگل کے قریب خام لوہے کی کافی مقدار موجود ہے۔

قوتِ محرکہ کا کام بجلی کے ذریعہ بہت کم لیا جاتا ہے۔ حالانکہ ہمارے پاس گودادری اور کرشنا جیسے دریا موجود ہیں جن سے ”جل بجلی“ بمقدار کثیر حاصل کی جاسکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جملہ ذرائع سے تمتع کیا جائے تو

دو لاکھ کیلو پٹل بجلی بآسانی پیدا ہو سکتی ہے۔ ہمارے پاس زیادہ تر کوئلہ قوت محرکہ کا کام دیتا ہے۔

گھوڑے بھینس لگائے۔ بیل بھیر اور بکریاں۔ یہاں کے پالتو جانور ہیں۔ ان سب چوپایوں میں سیلوں سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ کھیت جوتے۔ پانی کھینچنے اور بوجھ ڈھونے کا کام عموماً سیلوں ہی سے لیا جاتا ہے۔ کہیں کہیں بھینس بھی یہ کام کرتے ہیں۔ دودھ اور گھی یہاں کے لوگوں کی خاص غذا ہے۔ اس لئے گائے اور بھینس بھی بہت مفید ہیں۔ بھیر بکریاں ہر صوبہ اور ہر قصبہ میں موجود ہیں۔ گھوڑوں سے زیادہ تر بار برداری کا کام لیا جاتا ہے۔ یہاں مویشیوں کی کارکردگی عموماً گری ہوئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کی پرورش اور نگہداشت اچھی نہیں ہوتی۔ خصوصاً زرعی اغراض کے لئے جو مویشی استعمال کئے جاتے ہیں ان کی خاص نگہداشت کی ضرورت ہے۔

حیدر آباد کی کل آبادی ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے بموجب ایک کروڑ چوبیس لاکھ ہے تقریباً (۷۳,۷۰,۰۰۰) مرد ہیں اور (۷۰,۶۶,۰۰۰) عورتیں ہیں۔ مردوں میں جملہ کمانے والے (۴۷,۴۹,۴۷۷) ہیں اور عورتوں میں جملہ کمانے والی (۲۵,۵۲,۸۹۴) ہیں۔ اس طرح کام کرنے والے مرد اور عورتوں کی جملہ تعداد (۷۸,۰۲,۳۷۱) ہے اور بیکار مرد اور عورتوں کی جملہ تعداد (۷,۳۳,۷۸۵) ہے۔ جن میں معذوروں کی تعداد جو بھرے گونگے پاگل اور جذامی ہیں (۲,۲۱,۹۶۰) ہے۔

انسان یا معاشی اصطلاح میں مزدور مالک محروسہ میں اس قدر کافی تعداد میں موجود ہیں کہ متذکرہ وسائل قدرت سے افادہ اتم حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن اصولی اعتبار سے ہماری اس آبادی میں جند خامیاں موجود ہیں۔ پہلی خامی تو یہ ہے کہ آبادی کا بہت بڑا حصہ زراعت پیشہ ہے۔ کل (۸۳,۶۹,۳۱۴) افراد کی روزی بالواسطہ یا بلاواسطہ کاشتکاری پر منحصر ہے۔ صرف (۲۹,۳۶۸) افراد کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور ہیں (۷۶,۷۹۷) گھریلو دستکار ہیں۔ ظاہر ہے کہ ۲ لاکھ ۶۸ ہزار ایکڑ آراضی پر اگر ۸۳ لاکھ افراد کا بار ڈالا جائے تو دیگر پیشوں اور زراعت میں توازن قائم نہیں رہ سکتا۔ اسی بار کی وجہ سے زمینوں پر تقسیم و انتشار آراضی کا عمل درآمد شروع ہوا پیداوار فی ایکڑ کم ہونے لگی۔ نتیجہ کاشتکار مفلس اور مقروض ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایسے ملکوں میں جہاں کی آبادی کا بڑا حصہ زراعت پیشہ ہو خوش حالی کا سارا دار و مدار عموماً بارش پر منحصر ہے۔ اگر کسی سال بارش نہ ہو تو پھر پریشانی اور مفلسی کا دور دورہ رہتا ہے۔

دریا تیز رفتار اور زمین پتھر ملی ہونے کی وجہ سے جہاز رانی یا کشتی رانی ناممکن ہے۔ اس لئے سڑکوں اور ریلوں ہی کے ذریعہ نقل و حمل کا کام لیا جاتا ہے۔ سڑکیں تو ہر مقام پر موجود ہیں جو ایک قصبہ کو دوسرے قصبہ اور لے یہ تمام اعداد و شمار رپورٹ مردم شماری ۱۹۳۱ء سے لئے گئے ہیں۔

ایک ضلع کو دوسرے ضلع سے ملاتی ہیں۔ لیکن اہم سڑکیں چار ہیں (۱) حیدر آباد ناگپور روڈ (۲) حیدر آباد جالندہ روڈ۔ (۳) حیدر آباد موسلی ٹم روڈ (۴) حیدر آباد ورنگل روڈ۔

ریلیں ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہیں۔ لائنوں کا مجموعی طول (۱۶۶۴) میل ہے۔ سررشتہ ریلوے سرکار عالی کے تحت جملہ لائنوں کا طول اس وقت (۱۳۴۷) میل ہے جس کے منجملہ ۶۸۸ میل چوڑی پٹری اور ۶۵۹ میل چھوٹی پٹری ہے۔ موجودہ دور حکومت میں دو اہم لائنوں کا اضافہ ہوا۔ ایک تو سکندر آباد تا ڈورناظیم ریلوے لائن کی ترویج کے باعث جنوبی ہند سے نقل و حمل میں عدد درجہ سہولت ہو گئی۔ دوسرے بڑی لائن ۱۹۲۸ء میں قاضی پیٹھ تا بلہار شاہ کے اضافے سے شمالی ہندوستان کے لئے ایک نزدیک راستہ فراہم ہو گیا۔

ریلوں کے ساتھ ساتھ سرکاری بسیں بھی چلائی جا رہی ہیں۔ مالک محروسہ میں بسوں کی جملہ تعداد ۲۳۵ تک پہنچ گئی ہے۔ اور ان سڑکوں کا طول جن پر بسیں چلتی ہیں (۳۸۲۴) میل ہے۔ ریلوں اور بسوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی بھی بہت کچھ کوشش کی جا رہی ہے۔

صاحبزادہ میر سعود علی خاں
متعلم سال دوم۔ ورنگل کالج

غزل

اپنی ہستی مٹا رہا ہوں میں میں "کا پردہ اٹھا رہا ہوں میں
 ہنس رہا ہوں ہنسا رہا ہوں میں غم ماضی بھلا رہا ہوں میں
 کئے میں تحلیل ہو رہے ہیں شرر یہ نہ سمجھو کہ گار رہا ہوں میں
 جب سے جانا ہے زندگی گیا، خلیش دل بٹھا رہا ہوں میں
 اپنے دل پر تو اختیار نہیں اُن کو اپنا بنا رہا ہوں میں!!
 ساری محفل پہ ایک سکتہ ہے حال اپنا سنار رہا ہوں میں
 دل کی دُنیا اُجڑ چکی مسعود

اس کو پھر سے بسا رہا ہوں میں

صاحبزادہ میر مسعود علی خاں
 ششہ سال دوم و نکل کالج

مصر کا مشہور شاعر ابو العلامعری

زمانہ ہمیشہ آثار سلف کو مٹاتا رہا ہے۔ خدا جانے کیسے کیسے نازک خیال ادیب اور شاعر زمانہ کی بے توجہی سے نذر ہو چکے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں لیکن دنیا کے انہیں بالکمال اور غیر معمولی اہل علم و فن ہیں بعض ایسی ہستیاں بھی جلوہ گر ہیں جن کے روشن اور چمکتے ہوئے کارناموں کو زمانے کے آہنی ہاتھ بھی نہیں مٹا سکے۔ بلکہ وہ آج بھی پہلی سی آب و تاب کے ساتھ زندہ ہیں اس وقت بھی ان کے نام اور کام اہل علم کی محفلوں کیلئے سامانِ رونق بنے ہوئے ہیں۔

شعرائے عرب میں ابو العلامعری باوجود قدیم شاعر ہونے کے زندہ جاوید ہے۔ زمانہ کے ظالم ہاتھ اس شاعر کو او اس کے کلام کو نہ مٹا سکے۔

ادب عربی کے اس جدید دور میں جبکہ ابو العلامعری کے اہل وطن یعنی مصریوں نے انگریزی اور فرانسیسی ادب سے استفادہ کر کے نظم و نثر دونوں میں ایک خاص انداز ایجاد کیا ہے اور مناظر قدرت اور حقائق واقعتہ پر نتیجہ خیز اور حقیقت افروز نظمیں کہی ہیں۔ ایک قدیم شاعر کا ذکر بظاہر کوئی کشش نہیں رکھتا لیکن ابو العلامعری عربی ادب کے اُن انقلابی شعراء میں سے تھا جس نے دوسرے شعراء سے الگ اپنے لئے ایک نئی شاہراہ قائم کی۔ وہ ایک فطری شاعر تھا اور اس کا دماغ ایک موجد انسان کا دماغ تھا۔ اس کی شاعری میں روانی اور قوت کے آمیزے نے وجد کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اس قدر زمانہ گزرنے کے بعد بھی اس کے اشعار سننے والے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ یہ نرا ادیب اور شاعر ہی نہ تھا بلکہ مختلف علوم و فنون میں بھی کمال رکھتا تھا۔

ابو العلامعری ۳۶۳ھ میں مصر میں پیدا ہوا اور ۸۶ سال کی عمر پا کر ۴۴۹ھ میں انتقال کر گیا۔ اس نے گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور ۷۵ برس تک یہ شوق سخن جاری رہی۔

ایک ماہر علم و فن ہستی جب اتنے عرصہ دراز تک فطری ذوق و شوق کی مدد سے کسی پسندیدہ فن کی مشق کرتی رہے تو آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُس کی مہارت فن کا کیا عالم ہوگا۔

معری ایک آزادہ روشاعر تھا اس کا عمل تقلید سے بہت دور اور مجتہدانہ تھا جس طرح اُس نے اپنی شاعری میں اپنا راستہ الگ قائم کیا ہے اسی طرح اس کے معقولات بھی اپنے ہم عصروں سے نزلے تھے۔ اُس کا اعتقاد تھا کہ حیوانات کو ذبح کرنا اور ان کا گوشت کھانا انسان کیلئے سخت گناہ ہے۔ ۴۵ برس تک اُس نے گوشت نہیں کھایا کیونکہ گوشت خواری کو وہ حیوانات کو ایذا دینے کے مراد خیال کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے بدھ مت اور جین مت کے حکیموں کے خیالات کا مطالعہ کیا تھا اور اُن سے وہ اس قدر متاثر ہوا تھا کہ خود بھی انہیں کے رنگ میں رنگ گیا تھا۔ اس سے بھی عجیب تر اُس کا اعتقاد یہ تھا کہ دنیا میں اولاد پیدا کرنا سخت جرم اور گناہ ہے۔ کیونکہ یہ دنیا کالیفُ اَلام سے بھری ہوئی ہے۔ مزید نسل انسانی کو اس میں بھیجا لوگوں کو مصیبت میں پھنسانے کے ہم معنی ہے۔ چنانچہ اُس نے مرتے وقت یہ وصیت کی کہ میری قبر پر یہ شعر کندہ کر دیا جائے۔

هَذَا جَنَاهُ ابْنِي عَلَىٰ وَمَا جَنَيْتُ عَلَىٰ أَحَدٍ

(ترجمہ) یہ یعنی میرا وجود مجھ پر میرے باپ کا ظلم ہے۔ میں نے اولاد پیدا کر کے کسی پر ظلم نہیں کیا۔

”سقط الزند“ اس کا مشہور دیوان ہے۔ ”لزومیات“ اور ”شرح دیوان منتبی“ اس کی مشہور تصنیفات ہیں جب معری عرب کے مشہور شاعر ابو الطیب منتبی کے پاس اُس کے دیوان کی شرح لیکر گیا اور اُسے سنایا تو منتبی نے (جس نے اپنے کلام کی فصاحت و بلاغت اور اثر کے لحاظ سے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور اس لئے اُس کو منتبی یعنی بہ تکلف نبی بننے والا کہا گیا ہے) معری پر ایک مجذوبانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

اَنَا الَّذِي نَظَرَ اِلَى ادبِ وَاَسَمِعْتُ كَلِمَاتِي مِنْ بَدِ صَمَمٍ

(ترجمہ) میں وہ ہوں جس نے نابینا کو بینائے ادب بنا دیا (ادب کا مبصر بنا دیا) اور میں وہ ہوں کہ میرے کلمات نے ایک بہرے کو سننے والا بنایا۔

ابو العلامعری کا کلام ہم بخوف طوالت نقل نہیں کرتے لیکن اس کے ایک وجد آفریں اور مشہور قصیدہ کے چند منتخب اشعار ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کرتے ہیں۔

ہر زمانہ کے باکمال شاعروں اور غیر معمولی اہل علم و فضل نے ناقدر دانی زمانہ کی شکایت کی ہے۔ ابو العلامعری نے بھی اپنے اس قصیدے میں زمانے کی ناقدر دانی کی شکایت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اہل کمال کو گرایا جا رہا ہے اور ہر جاہل اپنے فریب اثر سے معزز بنا ہوا ہے۔ ناقص فضیلت کے مدعی ہیں۔ حاتم طائی کو کج محل سے موصوف کیا جا رہا ہے۔ بیوقوف عقل مندوں پر عیب لگا رہے ہیں۔ زمین آسمان پر طعنہ زن ہے۔ پتھر اور کنکر شہابِ ثاقب پر نہیں رہے ہیں۔ آخر میں کہتا ہے کہ اے موت جلد اسی زندگی تو بہت ہی بُری ہے۔

ایک شعر میں اُس نے یہ کہا ہے کہ اگرچہ آخری زمانہ میں پیدا ہوا ہوں لیکن میں وہ چیزیں لایا ہوں جو مجھ سے پہلے لوگ نہ لاسکے۔ مورخین نے بیان کیا ہے کہ ایک نوجوان لڑکا معری سے ملا اور کہا کہ اے چچا کیا وہ شعر تمہارا ہے جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ میں وہ چیزیں لایا ہوں جو پہلے لوگ نہ لاسکے اور کہا اے چچا پہلے لوگوں نے جس قدر حروف تہجی کی تعداد بنائی ہے آپ ان میں ایک حرف کا تواضاً ذکر دیجئے۔ معری کو کچھ جواب بن نہ پڑا۔ کہا یہ لڑکا غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے شاید زندہ نہ رہے۔

اُس کے مشہور قصیدہ کے منتخب اشعار درج ذیل ہیں:-

تَعَدَّ ذُنُوبِي عِنْدَ قَوْمٍ كَثِيرَةٍ وَلَا ذَنْبَ لِي إِلَّا الْعِلَاءُ وَالْفَضْلُ

(ترجمہ) ایک جماعت کے نزدیک میرے گناہ کثیر ہیں یعنی میں بڑا گنہگار ہوں۔ حالانکہ میرا گناہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں بلند مرتبوں اور اوصاف حسنہ کا حامل ہوں۔

وَقَدْ سَارَ ذِكْرِي فِي الْبِلَادِ فَمِنْهُمْ بِاخْتِفاءِ شَمْسٍ ضَمِثْهُائِمُتْكَامِلُ

(ترجمہ) میرا تذکرہ تمام شہروں میں پہنچ گیا ہے۔ پس کون ہے جو آفتاب تاباں کو جس کی روشنی کامل ہے چھپا سکے۔

وَأَتَى قَوْمِي كُنْتُ الْآخِرَ زَمَانَهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ تَسْتَطِيعُ الْإِذَاوِيلُ

(ترجمہ) اگرچہ میں آخر زمانے میں آیا ہوں مگر وہ چیزیں لایا ہوں جو اگلے لوگ نہیں لاسکے۔

وَلَمَّا رَأَيْتُ الْجَهْلَ فِي النَّاسِ فَاشْتِغَا تَجَاهَلْتُ حَتَّى طُنَّ إِنِّي جَاهِلُ

(ترجمہ) جب میں نے یہ دیکھا کہ تمام لوگوں میں جہالت پھیل گئی ہے میں جان بوجھ کر جاہل بن گیا یہاں تک کہ لوگ مجھے جاہل یعنی اپنا ہمرنگ خیال کرنے لگے۔

فَوَاجِعَا كَمْ بَدِيَ الْفَضْلُ نَاقِصُ وَوَاَسْفَا كَمْ يَظْهَرُ الْنَقْصُ كَامِلُ

(ترجمہ) حیرت ہے کہ کم علم تو فضیلت و علمیت کے مدعی بن گئے ہیں اور صد افسوس کہ اہل کمال اپنا نقص (انکساری طبع) کی وجہ سے ظاہر کر رہے ہیں۔

إِذَا وَقَفْتُ الطَّائِفَ بِالْبَحْلِ مَادِرَ وَعَبَّرْتُ بَابَ الْفَهَاتَةِ بِأَقْلُ

(ترجمہ) مادر جیسا بخیل زمانہ حاکم طائی جیسے سخی دوراں کو بخیل کہنے لگا اور باقل جیسا مشہور احمق قس جیسے خرد مند زمانہ کو بے وقوف کہہ رہا ہے۔

وَقَالَ لَدَجِي لِقَبْجٍ لَوْتُكَ حَائِلُ وَقَالَ لَسْتُهَا لَلشَّمْسِ رَأَتْ صَبِيلَهُ

(ترجمہ) سہما۔ سورج سے کہہ رہا ہے کہ تجھ میں روشنی نہیں۔ تاریک رات صبح درخشاں سے کہہ رہی ہے کہ تیرا رنگ سیاہ ہے۔

وطاوت الارض السماء سفاهةً وفاخرت الشهب الحملى والجنادل

(ترجمہ) زمین آسمان پر بیوقوفی سے طعنہ زن ہے اور شہاب ثاقب پر کنکر اور پتھر بہنس رہے ہیں۔

فيا موت ذر ان الحياة ذميمةً ويا نفس جدي ان دهرک هازل

(ترجمہ) اے موت جلد آیقیناً یہ زندگی نہایت ذلیل ہے۔ اے نفس کوشش کر بیشک تیرا زمانہ نہایت خراب ہے۔

يعقوب الرحمن عثمانی ونگل کالج

شکستہ دل

فضاؤں میں خموشی ہے اور اک عالم پہ سناٹا
 نہاں ہے بادلوں میں چاند سٹائے ہوئے کنریں
 روایتیں ظلمتوں کی جھٹپٹے میں اوڑھ لیں شب نے
 شب تاریک و تنہا میں فقط گریہ کناں ہوں میں
 شکستہ دل مرا اور ہر نفس اک آہ ہے ہمد
 نہیں کچھ زندگی میری بجز اک گریہ پیہم
 حسین کلیاں چٹک کر حسن کا پیغام دیتی ہیں
 تبسم ریزہ ہو کر مسیحا دامنِ سخاوت لیتی ہیں
 عنادلِ سناخ گل پر پتہ ہائے شوق گاتے ہیں
 چمن میں لالہ و گل حُسن کے قصے سناتے ہیں

۸۷
چمک تاروں سے لے کر آسمان سجلیاں لکیر
کھڑی رہتی، مضطر روز و شب فطرت مرد پر

حرارت سینہ خورشید سے طوفان سمندر سے
ہوا سے روح لے کر اور خوشبو نکلتی تے سے
مہ انور شعاعوں کا منور کارواں لے کر
شفق دامن میں اپنے سینکڑوں نگینیاں لے کر

مرے اُٹھے ہوئے دل کو سجانا چاہتی ہے پھر مے احساسِ مردہ کو جگانا چاہتی ہے پھر
مگر دل میں کوئی پھر آگ لگ اُٹھے یہ ممکن
حیاتِ نو کی پنگاری سلگ اُٹھے یہ ممکن

سید شاہ بلینغ الدین حسین متعلم سال دوم کلیہ درنگل

فراستِ ریاضی

(۱)

۷	۶	۳	۲
۱۵	۱۴	۱۱	۱۰

(۲)

۷	۵	۳	۱
۱۵	۱۳	۱۱	۹

(۳)

۱۱	۱۰	۹	۸
۱۵	۱۴	۱۳	۱۲

(۴)

۷	۶	۵	۴
۱۵	۱۴	۱۳	۱۲

آپ اپنے دل میں ایک اور پندرہ کے درمیان کسی عدد کو سوچ لیجئے اور دیکھئے کہ وہ عدد مندرجہ بالا چاروں جدولوں میں سے کس کس جدول میں ہے۔ جن جن جدولوں میں ہے اُن جدولوں کے اوپر والی قطاروں کے داہنی جانب کے کونے کے عددوں کو آپس میں جمع کر لیجئے۔ حاصل جمع وہی عدد ہوگا جس کو آپ نے سوچ لیا تھا۔

فرض کیا کہ آپ نے اپنے دل میں عدد (۱۴) کو سوچ لیا اور مندرجہ بالا جدولوں میں اُس عدد کو جدول (۱)؛ (۳)؛ (۴) میں دیکھ لیا۔ اب ان تینوں جدولوں کے اوپر والی قطاروں کے داہنی جانب کے کونے کے اعداد بالترتیب (۲)؛ (۸)؛ (۴) کو جمع کر لیجئے۔ ان تینوں اعداد کا حاصل جمع $(۲ + ۸ + ۴) = ۱۴$ یہی آپ کا عدد ہے۔

اسی طرح آپ ایک یا پندرہ یا ان کے درمیان کوئی عدد سوچ لیجئے اور اُن جدولوں کے اوپر والی قطاروں کے داہنی جانب کے کونے کے اعداد کو جمع کر کے جن میں کہ وہ عدد ہے جواب حاصل کر لیجئے۔

آلور راوہا کرشنن مورتی
معلم سال دوم کلیہ ورنگل

غلط فہمیاں

کتنی بڑی بڑی غلط فہمیاں ہوتی ہیں۔ جن سے بعض اوقات خوش قسمت انسان ایک ہی دن میں نجات پا جاتا ہے لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جن کی پوری زندگی اپنی غلط فہمیوں کی غلط فہمی میں گزر جاتی ہے۔ جمیل بھی اسی قسم کی ایک غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ اس کا خیال ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ سلطانہ کو اُس سے بے پناہ محبت ہے۔ اسی محبت جس کو کوئی چیز فنا نہیں کر سکتی۔ اُس کی آنکھوں میں غور کی چمک اور ہونٹوں پر تمکنت کی جھلک ہوتی۔ جب وہ کتا سلطانہ اگر اپنی زندگی سے میری محبت کو نکال دے تو اس کے پاس کچھ نہ رہ جائے گا۔ وہ ایک بے رنگ کی تتلی ہو کر رہ جائے گی۔ وہ ایک ایسا پھول ہو جائے گی جس میں خوشبو باقی نہ ہو۔“ اور وہ ایسا اکثر کہنے کا عادی تھا۔ وہ اس بات سے واقف تھا کہ اس کی موجودگی میں سلطانہ کا چہرہ پھول کی مانند شگفتہ رہتا ہے۔ اور مسکراہٹیں اُس کے ہونٹوں سے ایک لمحے کے لئے بھی جدا نہیں ہوتیں۔ اس کے دوستوں کا خیال تھا کہ اس کی فیروزہ موجودگی میں ہی سلطانہ کا چہرہ دیا سہی رہتا ہے۔ لیکن جمیل کو اُن کی بات کا یقین نہ آتا تھا۔

زندگی اور دنیا کے متعلق جمیل کے خیالات بالکل سیدھے سادھے تھے۔ وہ دیکھتا تھا کہ اسکے حلقہ احباب میں سے اکثر زندگی اور فاضلہ دنیا کے متعلق اظہار خیال کرنے سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور جب وہ ایسا کرتے ہیں تو عجیب و غریب الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اُس کا یقین صرف یہ تھا کہ خدا نے دنیا کو اسی طرح بنایا ہے جس طرح کہ وہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ لوگوں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی دیکھ کر وہ متحیر ہو جاتا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ لوگ کس طرح اس رنگ و بو سے لبریز دنیا میں افسردہ خاطر ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ متحیر بھی اس وقت تک رہتا جب تک کہ ایسے لوگ اس کے سامنے رہتے۔ پھر وہ بہت جلد ان کے متعلق سب کچھ بھول جاتا۔

جہاں تک حیات اور کائنات کا تعلق تھا وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ انسان کو صرف اس قدر کوشش کرنی چاہئے کہ مسکراتا رہے۔ ”تسم ہی میں حیات پوشیدہ ہے“ وہ کبھی بخیدہ بننے کی کوشش کرتا تو بھی صرف اس قسم کا فقرہ

کہہ پاتا اور بس۔ وہ خدا کے وجود عالم اسباب کی علت غائی انسانوں کے نام نہاد فرائض کے متعلق سوچنے کے لئے کوئی وقت نہ رکھتا تھا۔ اس نے یقین کر لیا تھا۔ اور اپنے اسی یقین کی وجہ سے خوش اور مطمئن رہ سکتا تھا کہ خدا موجود ہے اور مرہبان۔ عالم اسباب کی علت غائی کے بارے میں اگر اس سے سوال کیا جاتا تو وہ گھبرانے لگتا۔ اور ایک لفظ بھی نہ کہہ سکتا۔ کیونکہ اس نے کبھی اس چیز پر غور ہی نہ کیا تھا۔ اور اسے فرصت بھی کہاں تھی۔ انسانی فرائض کے بارے میں وہ اتنا جاننا تھا کہ خود کو اور دوسروں کو خوش کرنا اور خوش رکھنا انسانی فرائض میں داخل ہے۔

وہ مطالعہ کتب کا زیادہ شائق نہ تھا۔ اخبارات اور رسائل سے بھی اُسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اور اگر وہ کبھی اخبارات میں لیتا بھی تو صرف ”لوکل“ خبریں پڑھتا۔ وہ خود ایک کتاب یا اخبار تھا جس کا لوگ مطالعہ کر سکتے تھے۔ اس کے پاس وقت نہ تھا کہ دوسروں کا مطالعہ کرے۔

سلطانہ کسی زمانہ میں اس کی کلاس میٹ تھی۔ پھر یہ کوئی غیر فطری امر بھی نہ تھا کہ وہ سلطانہ سے مانوس ہو جائے اور دلچسپی لینے لگے۔ اُس کی فطرت اُن چیزوں سے اُلجھتی تھی جو اس کی سمجھ میں نہ آ سکتی ہوں۔ مگر سلطانہ اُن چیزوں میں سے نہ تھی۔ وہ پہلی ملاقات کے بعد ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا ہے۔ ایک خوش مزاج، خوش پوش، تندرست اور بے پروا لڑکی۔ اس کے خیالات میں کوئی انوکھا پن نہ تھا۔ وہ بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دوسرے انسانوں کی طرح سوچتی ہے سمجھتی ہے اور انہیں کی طرح گفتگو کرتی ہے۔ اس کی فطرت میں کوئی بات حیرت انگیز نہ تھی۔ وہ جب ہنستی تو صرف ہنسنے کی خاطر بناوٹ اور تکلف کا اسکے مزاج میں دخل نہ تھا وہ خوبصورت اور شاندار لباس پہنتی تو ہمیشہ متمنی ہوتی کہ لوگ اس کے لباس کو پسند کریں اور جب کوئی کہتا کہ وہ اپنے شاندار لباس میں بہت ہی اچھی معلوم ہو رہی ہے تو وہ مسکرا کر شکریہ ادا کرتے کرتے یہ بھی کہہ دیتی کہ ”اُسے بھی ایسی ہی اُمید تھی“ اور اُسے یقین تھا کہ وہ اس لباس میں ضرور اچھی معلوم ہو رہی ہوگی۔ وہ کبھی اپنے خیالات کو پُچھپاتی نہ تھی۔ کیونکہ جو خیال بھی اس کے دل میں آتا وہ سادہ سادہ اور بے ضرر سا ہوتا۔ اگر وہ اپنے دوستوں سے کبھی یہ کہنے سے نہ بھجکتی تھی کہ اُسے ناشپاتی سے زیادہ سیب، سیب سے زیادہ انجیر اور انجیر سے زیادہ انگور پسندیں تو اس میں تعجب ہونے کی کوئی بات نہ تھی۔ واقعی اُسے انگور بہت زیادہ پسند تھے۔ پھر جمیل اور سلطانہ کی ہم مذاقیوں نے انہیں ایک دوسرے سے مانوس کر دیا تو اس میں اچنبھا کو نہ تھا؟ لوگ اس بات کا ذکر رازدارانہ کیوں کرتے تھے؟ اور ان دنوں کو عجیب نظروں سے کیوں دیکھتے تھے؟ کیا یہ کوئی حیرت انگیز بات تھی؟ اور اگر تھی بھی تو سلطانہ کے پاس اتنی فرصت نہ تھی کہ ان گتھیوں کو سلجھائے۔

لیکن آج وہ ایک نئی شخصیت کا مطالعہ کر رہی تھی صدیقی اُس کی خالہ کا لڑکا اور اپنی ماں کی وسیع جائیداد کا تنہا مالک آج کل اس کا ہمان تھا۔ جمیل اور صدیقی کی شخصیتیں، فطرتیں، دلچسپیاں غرض کہ ہر چیز مکتہ حد تک مختلف تھی۔ وہ ایک دوسرے

کے بالکل متضاد تھے۔ اور یہ ہی وجہ تھی کہ سلطان نے بھی پہلے پہل صدیقی کی صحبت میں اپنے آپ کو اجنبی سمجھوس کیا۔ مگر بہت جلد اُس سے مانوس ہو گئی۔ اور اُسے محسوس ہوا کہ وہ اُسے پسند کرتی ہے۔ پھر جب دوسرے دن جمیل اُس سے ملنے آیا تو صدیقی کا تعارف اُس سے کرتے ہوئے اُس نے کہا کہ ”مجھے ناشپاتی سے زیادہ سیب سب سے زیادہ انجیر انجیر سے زیادہ انگور اور انگور سے زیادہ مٹر صدیقی پسند ہیں“ یہ کہہ کر وہ بہت ہنسی۔ کیونکہ اُس کا ہنسنے کو جی چاہ رہا تھا جمیل بھی اس کی ہنسی میں شریک رہا۔ صدیقی صرف ذرا سا مسکرایا اور خاموش ہو گیا۔ وہ عجیب شخص تھا بہت کم ہنستا تھا۔ مسکراتا بھی کبھی کبھی تھا۔ اُسے اپنا مکروہ اور اپنی کوتاہی بہت پسند تھیں۔ اُس کا زیادہ تر وقت لکھنے میں صرف ہوتا اور وہ ہمیشہ پچھلی کی طرح خاموش رہنے کا عادی تھا۔ سنجیدگی اُسے دل سے پسند تھی۔ ایک دفعہ سلطان بلا اطلاع اُس کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اُسے لوگوں کو چونکا دینے میں لطف آتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اس کی کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ اور ایک غیر فطری آواز نکال کر اُسے ڈرا دیا۔ صدیقی اپنی کتاب کا دیباچہ لکھ رہا تھا۔ ایک دم چونک پڑا۔ اور جب سلطان کے شیرچہرہ کو دیکھا تو چند تانیوں کے لئے مسکرا دیا۔ ”دیکھو سلطانہ!“ پھر اس نے سنجیدہ آواز میں کہنا شروع کیا۔ ”تمہیں یوں نہ کرنا چاہئے تھا۔ تمہیں ایسے یہاں نہ آجانا چاہئے تھا۔“

”کیوں نہ آجانا چاہئے تھا؟“ سلطانہ نے چیں بچیں ہو کر پوچھا ”میرا جی جو چاہ رہا تھا؟“

”انسان کو ہمیشہ جو اُس کا جی چاہے وہ نہ کرنا چاہئے۔“ صدیقی نے پہلے سے زیادہ سنجیدہ آواز میں کہا۔

”فلسفیوں کی سی باتیں کرتے ہوئے تمہیں ڈرنیں لگتا صدیقی؟“ اُس نے پوچھا۔ ”کیا میں انہیں دیکھ سکتی

ہوں؟“ اُس نے اُن کا غذا پر نظر ڈالتے ہوئے کہا جو میز پر بکھرے ہوئے تھے۔

”کیوں نہیں“ صدیقی نے کہا۔ ”مگر شاید تمہارے کچھ بھی سمجھ میں نہ آئے۔“

”تو آپ کا مطلب ہے کہ میں نے بی اے تک بیکار رہی لکھا پڑھا ہے۔“ سلطانہ نے کاغذات کو اٹھا کر دیکھتے

ہوئے کہا۔ جس فقرہ پر اس کی نظر سب سے پہلے پڑی وہ یہ تھا۔ ”انسان کے تصورات ہمیشہ اپنے سے مختلف اور عجیب

شنے کی تلاش میں رہتے ہیں“ عجیب وغریب خیال“ سلطانہ نے زیر لب کہا۔ لیکن چونکہ یہ بات اُس کی پوری طرح سمجھ

میں نہ آئی تھی اس لئے اُس نے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کی۔

پھر ایک مرتبہ یوں ہوا کہ صدیقی پائین باغ میں نیم کے ایک پُرانے درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ اور کچھ کھویا کھویا

ساتھا۔ وہ خاموشی سے آئی۔ شام کا وقت تھا۔ اور باغ میں ہر طرف گویا زندگیاں پڑی مسکرا رہی تھیں۔ سلطانہ کی رگ

رگ میں بھی زندگی ہی زندگی تھی۔ عموماً ایسے موقعوں پر انسان اپنے اندر ایک خاص قسم کی تازہ قوت کا بردگی محسوس

کرتا ہے۔ اس وقت سلطانہ کے دل میں بھی وہی جذبہ بڑی شدت سے کام کر رہا تھا۔ اُسے ٹھیک طور سے سمجھ میں نہیں

آ رہا تھا کہ اس کا جی کیا چاہ رہا ہے۔ کبھی وہ چاہتی تھی کہ روشوں پر تیزی سے بھاگے۔ اس صورت میں کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہو۔ کبھی اس کا دل اُچھلنے کو چاہتا اتنا ادبچا کہ بلند درختوں کی ادبیری شاخوں تک پہنچ جائے۔ اور کبھی زور زور سے ہنستا چاہتی۔ آہستہ آہستہ بچوں کے بل وہ آگے بڑھی اور گھڑی کی سی پھرتی سے درخت پر چڑھ گئی۔ صدیقی اس وقت تک بیخبر تھا۔ اب وہ شاخ پر لیٹی ہوئی اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی اس کی طرف دیکھے۔ اس لئے بہت سارے پتے توڑ کر اس کی طرف پھینکے۔ وہ ہمیشہ دہی کرتی جو بغیر کسی کوشش کے سب سے پہلے اس کی سمجھ میں آ جاتا۔ اور اس وقت صدیقی کو مخاطب کرنے کی یہی صورت اُسکی سمجھ میں سب سے پہلے آئی تھی۔ صدیقی نے گردن اٹھائی اور ”ارے“ کا لفظ اس کے منہ سے نکل گیا۔ سلطانہ ہنس رہی تھی۔ ”کو صدیقی کیا میں اس وقت اپنے محترم والد ڈارلن مرحوم کی لگی بیٹی نہیں ہوں؟“ اس نے پوچھا۔ صدیقی مسکرایا۔ سلطانہ کو اس کی مسکراہٹ میں بڑا اظہار آتا تھا۔ تاہم اس کے ساتھ ہی ایک قسم کا خوف بھی اس کے دل میں پیدا ہو جاتا تھا۔ یہی قسم تھا جو اُسے سوچنا سکھا رہا تھا۔ یہی مسکراہٹ تھی جو اس کے خوش مزاج چہرے پر کبھی کبھی تھکے کے ہلکے نقوش پیدا کر دیتی تھی۔ وہ ایسا محسوس کرتی تھی جیسے بعض اوقات اپنی خوش دلیوں اور خوش وقتوں کے درمیان کچھ سوچنے کے لئے ٹک جانا چاہتی ہے۔ اُس نے اپنی نظرت سے ایک سوال کیا تھا۔ اور اس کے جواب کی طالب تھی۔

عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ چڑھنے سے زیادہ اُترنا آسان ہوتا ہے۔ لیکن درخت کی صورت میں یہ بات نہیں سلطانہ درخت پر بڑی آسانی سے چڑھ گئی تھی۔ لیکن جب وہ اُترنے لگی تو اس کی مطلق سمجھ میں نہ آیا کہ کیونکر اُترے وہ اپنے پاؤں کے لئے شاخوں میں جگہ تلاش کرتی لیکن ناکام رہتی۔ سنجیدہ مزاج صدیقی نے اُسکی دُخاویوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنی خدمات پیش کیں جنہیں سلطانہ نے فوراً منظور کر لیا۔ جب اُسے اس کی ضرورت تھی۔ جب وہ بغیر مدد کے نہ اُتر سکتی تھی۔ تو پھر انکار کی ضرورت ہی کیا تھی۔ بہر حال وہ صدیقی کی مدد سے درخت سے اُتر آئی۔

ایک دن سلطانہ اور اس کا تمام خاندان کھانے کی میز کے گرد جمع تھا۔ صدیقی بھی موجود تھا۔ وہ خاموش بیٹھا آلو کی ترکاری کھانے میں مصروف تھا۔ اُسے آلو بہت پسند تھے سلطانہ اپنی چھوٹی خالہ زاد بہن کے فرائیڈ میٹھا نکال رہی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتی۔ ”لو کیاں جب چڑ کر جواب دیتی ہیں تو بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں۔“ ”میرا خیال ہے۔“ اس نے ایک دم سے صدیقی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ”موسم سرما کی دوپہر سیر و تفریح کے لئے بہت موزوں ہوتی ہے۔ آج ہم ٹھیک بارہ بجے باغ میں چلیں گے۔“

”اے سیر و تفریح کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم باغوں کی روشنیوں پر مہوہوم سرتوں کو تلاش کریں“ صدیقی نے کہنا شروع کیا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرشتے اپنے پردوں کا سایہ گئے بیٹھے ہیں۔ کیونکہ اس کی نگاہیں دھندلی دھندلی ہو رہی تھیں۔ ”اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب میں اپنی مطالعہ گاہ میں ایک کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد مطمئن اور آسودہ بیٹھتا ہوں تو میں محسوس کرتا ہوں کہ باغِ جنت کی خوبصورتیاں اور لطافتیں میرے لئے مہیا کر دی گئی ہیں۔ اور میں ان کی دستوں میں آزادانہ پرواز کر رہا ہوں۔ میری روح میرے سینہ سے باہر آکر ساری دنیا کی سیر کر رہی ہے۔ اور میرا جسم باوجود روح کی غیر موجودگی کے زندہ رہتا ہے۔“

سلطان نے چاہا کہ ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر صدیقی پر یہ ثابت کر دے کہ وہ اس کے خیال سے متفق نہیں ہو سکتی۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ اور خاموش ہو گئی۔

”یہ عجیب بات ہے کہ“ ایک دن سلطان نے اپنی ایک سیلی سے کہا۔ ”جہیل باوجود ایک بہت ہی نیشن ایبل نوجوان ہونے کے نیک ٹائی اتنی خوبصورت نہیں باندھ سکتا جتنی کہ صدیقی“ اس کی سیلی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور مسکرا دی۔

صدیقی جو کتاب لکھنے میں مصروف تھا وہ ختم ہو چکی تھی۔ سلطان نے اس کتاب کو پورا پڑھا تھا۔ حالانکہ وہ کبھی ایسی کتابیں نہیں پڑھتی تھی جو اس کی سمجھ میں نہ آتی ہوں۔ پھر ایک مرتبہ کی صحبت میں شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ ہوا تھا۔ تو اس نے کہا۔ ”کہ صدیقی ہندوستان کے نوجوان ادیبوں میں ایک خاص درجہ رکھتا ہے۔“ اور اس نے اُس کی کتاب کا اس طرح مغرورانہ ذکر کیا گویا وہ خود اس کی لکھی ہوئی تھی۔

جہیل کو یقین تھا کہ وہ صرف سلطان کے ساتھ خوش رہ سکتا ہے اور بس۔ اُسے جیسے سلطان سے محبت کرنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ محبت اور عادت میں کس قدر وسیع تعلق ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ اس کی بے چینیوں کس حد تک پہنچ گئی ہوں گی۔ جبکہ اُس نے سلطان کے خط کو پڑھا جس میں اس کی پیش کردہ کر دیا گیا تھا۔ وہ اپنے کمرہ میں غلین اور انصر وہ خاطر بیٹھا تھا۔ اپنی عمر میں وہ پہلی دفعہ متفکر نظر آ رہا تھا۔ اُسے خبر نہ تھی کہ ایسے موقع پر لوگ کس قسم کی باتیں سوچا کرتے ہیں۔ تاہم یہ تو اس کی صورت سے ظاہر تھا کہ وہ بہت ہی ملول ہے۔ ایک مرتبہ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ سلطان کی محبت کے غم میں اس کی صورت کیسی ہو گئی ہے۔ وہ آئینہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ چہرے کے پڑمردہ نقوش کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بے نیالی میں ٹائی درست کرنے لگا شام کو اس کا بے تکلف دوست ریاض آیا۔ اور باغِ عام چلنے کے لئے مجبور کیا۔ پہلے تو وہ راضی نہ ہوا۔ اور ہنسی

کیسے سکتا تھا۔ اُسے سلطانہ سے محبت جو تھی؟ ”اُس کے انکار نے میرا دل بُری طرح توڑ دیا ہے۔ میں آج باغ کیسے جاسکتا ہوں۔“ لیکن ریاض کی گفتگو میں بے پناہ لطافتیں اور دلچسپیاں تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد سلطانہ کی محبت کا سنایا ہوا جھیل اپنے دوست کے ساتھ خوش گیتوں میں مصروف تھا۔ وہ باغ عام بھی گیا۔ جہاں اس کی بالکل اتفاقاً ایک خاتون سے ملاقات ہو گئی۔ اور جب وہ گھر واپس آ رہا تھا تو سوچ رہا تھا وہ کیسی عجیب عورت ہے۔ وہ ہنستی کم ہے۔ چہرہ پر ہلکی سی افسردگی آمیز سنجیدگی ہے۔ اس کی آنکھیں اس قدر زیادہ عمیق اور پُر معنی کیوں ہیں؟ اس نے سوچا ”میں ان کے معنی سمجھنے کی کوشش کروں گا۔“ لوگ معمہ حل کرنے کے اتنے کیوں شائق ہوتے ہیں۔ یہ مجھے آج معلوم ہوا۔“ اُس نے گھر آ کر سلطانہ کے خط کو ایک مرتبہ اور پڑھا۔ لیکن اس میں کوئی بات ایسی معلوم نہ ہوئی۔ جو ناقابل برداشت ہو۔ اُس نے خیال کیا۔ اس میں نئی بات کون سی ہے۔ اور سلطانہ شاید ایک مکمل بیوی نہ ثابت ہو سکتی۔ وہ ایک کم عمر اور شریر لڑکی ہے۔ بیوی بننے کی اس میں مطلق قابلیت نہیں۔“

لوگوں کا خیال تھا کہ یہ ایک نہایت ہی تعجب انگیز بات ہے کہ سلطانہ کی شادی صدیقی سے ہو جائے۔ لیکن لوگوں کے تعجب کرنے سے یہ شادی رُک نہ سکتی تھی۔ شادی کے دن سلطانہ کی سہیلیوں میں سے ایک نے کہا۔ ”سلطانہ یہ آخر تم نے ایک صاف صاف دلچسپ اور سادہ عبارت میں لکھی ہوئی کتاب کو چھوڑ کر ایک ایسی ضخیم۔ غیر مانوس الفاظ اور محاوروں سے بھری ہوئی اور چنڈھے چھا پے کی کتاب کیوں پسند کر لی۔“ میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔“

سلطانہ اپنی سہیلی کا مطلب سمجھ گئی۔ اور مسکرائی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جو صرف دُہنیں مسکرا سکتی ہیں۔ ”اس لئے کہ“ اس نے کہا ”اس لئے کہ پہلی قسم کی کتاب کے متعلق مجھے یقین ہو گیا تھا کہ بہت جلد اُسے ختم کر لوں گی۔ اُسے سمجھنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔ اُسے پڑھنے میں مجھے مطلق وقت نہ ہوگی۔ پھر تمہیں بتاؤ ہن۔“ اس نے اپنی آنکھیں جھکا کر سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کہ ایک ایسی کتاب خرید کر میں کیا کرتی۔ کیا میں بہت جلد اس سے تھک نہ جاتی۔ میں اُسے بغیر خریدے ہی پڑھ سکتی ہوں۔ دوسری قسم کی کتاب میں جیسا کہ تم کہتی ہو فلسفیانہ خیالات، مشکل ترکیبیں اور غیر مانوس الفاظ و محاورات ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ اس کتاب کو پڑھنے کے لئے مجھے کتنے وقت کی ضرورت ہے۔ اس کی چھپائی دھندلی ہے جانتی ہوں میری بصارت کو اس کے پڑھنے کے لئے کس قدر تیز ہو جانا پڑے گا۔ اس کے الفاظ و محاورات

غیر مانوس ہیں۔ کیا تم نہیں سمجھ سکتیں کہ ان کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے مجھے کتنا مشغول رہنا پڑے گا۔ توہن میں نے اس کا انتخاب اس لئے کیا ہے کہ مجھے بار بار کتابیں نہ خریدنا پڑیں۔ اور ایک ہی کتاب میری عمر بھر کی مشغولیتوں کے لئے کافی ہو جائے۔“ وہ اتنا طویل فقرہ کہنے کے بعد بھی مُکرا رہی تھی۔ اور اس کی سہیلیوں کا خیال تھا کہ اُس نے کبھی اتنا طویل اور ذومعنی فقرہ نہیں کہا تھا۔

رابعہ بیگم

الحب

سلام اے خسروِ خواں مزاجِ حُسن کیسا ہے؟
 جہانِ حُسن میں کیا جُرم ہے پھولوں کا چھولینا؟
 یہ سہم بے سبب آزدگی آخر خطا کیا ہے؟
 گناہِ عشق ہے کیا شوق کا اظہار کر دینا؟
 مری جا کیوں کی سادگی پر خشکیوں کیوں؟
 مری جا کیوں کی سادگی پر خشکیوں کیوں؟
 کہ موتی کو جلا دیتی ہے سیپی کی ہم آغوشی!
 بہارِ حسنِ بطنِ عشق سے یونہی نکھرتی ہے!
 کنارِ مہر میں جا کر سحرِ شب تاب ہوتی ہے!
 کہو کیا بھید ہے نغمہ کی جادو آفرینی کا؟
 نہیں ممکن تعینِ خیر و شر کی حدِ فاصل کا!
 لبِ جو خود سہرا نہ آہِ لبِ تشنگی کیسی!
 رہو بلخِ جہاں میں اعتبارِ رنگ و بو بن کر
 مثلاً نو عروساں شاد کام آرزو بن کر
 دباؤِ بارِ غم سے یوں نہ اپنی نوجوانی کو
 اسے دامن میں رہنے دو کہ میکے شوق کی کُنیا
 محبتِ اک مہکتا پھول ہے گلزارِ مہستی کا

اختر ایم۔ اے
 "ایڈمنسٹریٹو"

عزلیتا

(۱)

زندہ ہوں سقِ حُسنِ رخ یار دیکھ کر
کیوں پھنک گیا نہ تابشِ انوار دیکھ کر
جائے ہوئے نگاہ سے موتی لٹا گئے
سیلابِ چشمِ شوقِ کُہر بار دیکھ کر
نقدِ حیاتِ عشق کی بے قیمتی نہ پوچھ
خنجرِ بکفِ اُنہیں سرِ بازار دیکھ کر
صحرا کی وسعتیں تھیں اک مامنِ جنوں
وحشت ہے پھر مجھے رو دیوار دیکھ کر
شمس و قمر بھی رشک سے بے نور ہو گئے
اختر کو کیفِ عشق سے سرشار دیکھ کر

سید عبدالکریم اختر شتم سال اول عثمانیہ کالج ہنگوٹہ

(۲)

پھر اک نگاہِ مست کا سا غریبا کے دیکھ
بادِ کشتوں کے طرف کو پھر آزما کے دیکھ
دُنیا کو انتظار ہے پھر انقلاب کا
محنتِ خرامیوں سے قیامت اٹھا کے دیکھ
۷ ذمہ مرا جو جھوم نہ جائے تمام بزم
بربط کو چھپڑ، نغمہ رنگیں سنا کے دیکھ
پھر ہوش آچلا ہے مجھے بزمِ ناز میں
ہاں پھر اُسی ادا سے ذرا مسکرا کے دیکھ
کلیاں مری امید کی بجائیں کاش اچھو
اے جانِ نو بہار مجھے مسکرا کے دیکھ

زاہد ہماری رندی موتی سے مت الجھ گر ہو سکے تو زہد کا پردہ اٹھا کے دیکھ
 کھلتی ہے سخن باغ میں کس رنگ سے کلی وقت طلوع میری طرف مسکرا کے دیکھ
 سرمایہ بہار ہے زخمِ دلِ عظیم
 اس گلستاں کو ایک نظر تو بھی آ کے دیکھ

عظیم (عثمانیہ)

(۳۲)

شبِ غم ہے دراز کیا کہنا باپِ رحمت ہے باز کیا کہنا
 باپِ میخانہ جیسے واہو کوئی نگہِ نیم باز کیا کہنا
 مرجا اے تبسمِ رنگیں ! بجلیوں کو ہے ناز کیا کہنا
 دل کھنچا جا رہا ہے اسکی طرف کششِ حسن و ناز کیا کہنا
 مجھ کو غمِ غیر کو خوشی بخشی نگہِ استیاز کیا کہنا

جس پہ خود عاشقیِ فدا ہو عظیم

ایسی ہستی کا راز کیا کہنا

عظیم (عثمانیہ)

نسوانی تعلیم کی اہمیت

تعلیم حقیقی معنوں میں انسان کو مکمل انسان بناتی ہے۔ اور انسان میں مرد و عورت دونوں شامل ہیں۔ تعلیم انسان کو وہ تمام اوصاف و خصائل عطا کرتی ہے جو ایک مہذب اور متقدم انسان میں ہونے چاہئیں۔ اکثر حضرات اس مغالطہ میں ہیں کہ ”عورت کے لئے تعلیم غیر ضروری ہے۔“ میرے خیال میں عورت کے لئے بھی تعلیم ایسی ہی ضروری ہے جیسے مرد کیلئے۔ آغوش مادر ملک اور قوم کے لئے ایسی ہستیاں تیار کرتی ہے جن پر اُس ملک و قوم کی ترقی کا انحصار ہوتا ہے۔ نو نملان ملک و ملت عورت ہی کے آغوش میں پھلتے پھولتے ہیں۔ دُنیا کی زینت قوموں کی عزت عورت ہی سے ہے۔ صبر و رضا مہر و وفا غنٹ حیا عورت کی خصوصیات ہیں۔ اور بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ نسل انسانی کی اصلاح کا گوارہ اولین عورت کی آغوش ہی ہے۔ نسوانی تعلیم سے غفلت کا ارتکاب نسل انسانی کی المناکی و بربادی کا عین سبب ہوتا ہے۔ مذہب اسلام نے عورت و مرد کو یکساں تحصیل علم و فضل کا حکم دیا ہے۔ پھر کون امر مانع ہے کہ شرعی حکم ہوتے ہوئے بھی عورت کو جہالت کے پردہ میں چھپا رکھا جائے۔

تعلیم یافتہ عورت ملک و قوم کی حالت کا صحیح اندازہ کر سکتی ہے۔ وہ جو اپنے ملک کی آئندہ نسلوں کی ماں بننے والی ہے اپنے ہونا بچوں کو اعلیٰ تربیت دے سکے گی۔ وہ ایسی جوی ہوگی جو اپنے شوہر کو خوش رکھ سکے گی اُسے دُنیا کے افکار کے بعد مسرت و اطمینان کی چند گھڑیاں ہتیا کرے گی۔ جو خانہ داری کے جملہ انتظامات روپے کا صحیح مصرف خادموں کی نگرانی ضروری خانگی اشیاء کی خرید و فروخت کے تفکرات سے مرد کو آزاد کر سکے گی۔ جو اپنی نمود و نمائش کو سادگی اور خوش سلیقگی پر قربان کر سکے گی جو مغربی فیشن پرستی اسراف اور بیجانی کا مقابلہ کرنے والی ہوگی جو اپنے بچوں کی تربیت اپنے میاں کے بغیر کر سکے گی۔ انہیں صادق نیک محنتی تعلیم کا شیدائی بہادر بنا سکے گی۔ ہمارے ملک کی آئندہ نسلوں کو ایسی عورتوں کی ضرورت ہے اُسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ ہماری عورتیں تعلیم یافتہ ہوں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہندوستان کی مسلمان عورتیں رسمیات اور اوہام کی کس قدر غلام بنی ہوئی ہیں اور اس کے نتائج قدر خطرات ہیں اس کا سبب مجھے تعلیم

سے ناآشنائی ہے۔ تعلیم کی بدولت وہ اپنی ذات اور اپنا حق اور اپنے فرائض کو پہچان لیں گے۔ تعلیم کی بدولت ان میں کھانے پینے کا سلیقہ رہنے کی عمدگی اور آسائش و حفاظت اور صحت کے اصول پر عمل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ تعلیم سے محدود خیالی دور ہوتی ہے۔ تعلیم یافتہ عورت دنیا کی ہر چیز پر عقل اور سمجھ سے غور کر سکتی ہے۔ اپنی آمدنی کو بڑھانے اور خرچ کو گھٹانے کا خیال رکھتی ہے۔ اور اپنے ماں باپ شوہر بچوں اور قرابت داروں اور اہل ملک کے ساتھ عمدہ برتاؤ کرنا سیکھتی ہے۔ تعلیم یافتہ عورت سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ہر وقت دوسروں کو خود خوش رہنے کی کوشش کرے گی۔ تعلیم یافتہ عورت ہر ایک کے سامنے گھر کی مصیبت اور تکلیف بیان نہیں کرتی سوائے ان کے جن سے اچھے مشورہ و امداد کی توقع ہو۔ خدا ان کو خوش رکھتا ہے اور ہر مصیبت میں خوش کرنے کے سامان پیدا کرتا ہے جو خود خوش رہنا چاہیں اسی کے مطابق ان کا طریقہ عمل ہوتا ہے۔ عورتوں کو ایسی عمدہ تعلیم دینی چاہئے کہ وہ روشن خیال نہیں وہ اپنے نفع نقصان کو پہچان سکیں۔

ایسی تعلیم یافتہ عورت بلا تخصیص مذہب ایک دوسرے کی مدد کرے گی۔ ایک دوسرے کے دکھ ٹکھ میں شریک ہوگی۔ شوہر کی اصلی مونس و غمخوار ہوگی۔ بچوں کی رہبر و رہنما ہوگی اور گھر کی باقاعدہ منتظم ہوگی برخلاف اس کے جب ہماری نظر غریبہ تعلیم یافتہ عورت کی جانب پڑتی ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ اُس کو نہ اپنے فرائض کا احساس ہوتا اور اور نہ مردوں سے اپنے حقوق حاصل کرنے کی اہلیت کھتی ہے اور چونکہ بنیاد ہی ٹھیک نہیں ہوتی اس لئے بچوں کی زندگی شروع ہی سے برباد و تباہ ہو جاتی ہے وہ حیوانوں کا ایک گلہ ہوتے ہیں جو ماں کی موجودگی کو ایک ڈنڈے والے چرواہے سے زیادہ نہیں سمجھتے۔

الغرض قوموں کی کامیابی اور ترقی کا راز اسی نسوانی تعلیم میں پوشیدہ ہے جس قوم فراس نکتہ کو جان لیا وہ آخر کار دنیا کی ترقی یافتہ اور متمدن قوم ہو کر رہے گی۔ اگر کسی عورت میں باوجود تعلیم حاصل کرنے کے یہ خوبیاں پیدا نہ ہوں تو یہ تعلیم کا قصور نہیں۔ اکثر اشخاص کا خیال ہے کہ عورت پر تعلیم سے بُرے اثرات پڑتے ہیں۔ یہ ان کی کوتاہ خیالی ہے۔

سید عبدالباقی حسینی

معلم جماعت نم۔ کلید درنگل

مکالمہ دولت و تعلیم

دولت و تعلیم میں کد ن چھری یہ گفتگو شبہ ہائے زندگی میں میں ہوں ضلالت کو تو
ہنس کے دولت سے کہا مجھ پر اک دنیا نشا مجھ سے وابستہ ہے بزم عشق و عشرت کی بہا
ہے مکر ابر کرم کا قطرہ طوفان نشاط میری حشیم ناز کی جنبش ہے موج انبساط
غیرت تاج جہان بنانی مری باپوش ہے حسن یوسف کی تجلی گمہ میری آغوش ہے
میری چٹکی کھولتی ہے عقد ہائے دلخراش زرفشانی ہے مری مقراض صد عصیا تراش
میری چتون کا تبسم گلشن ناز و نعم آبیار باغ رضواں ہے میرا دست کرم
میری الفت کا صدق وصل لیلۂ جمال میری ناراضی کا پرتو، نچ و غم درد و ملال
میں ہوں شعلہ فروغ زندگانی جس سے ہے عالم پیری میں بھی لطف جوانی جس سے ہے
اور تو وہ ہے کہ جس اک جہاں نجد ہے، آنکھ ہر مصوم کی صدمات سے نم دیدہ ہے
تیری آمد کی خبر سے سلب آزادی ہوئی ولولے دل کے مٹے اور تن کی برباد ہوئی

بندشیں ہونے لگیں اور قید میں جکڑے گئے بے اجازت جس جگہ پہنچے وہاں پکڑے گئے
 قہجیوں پر قہجیاں کھانے لگے اُستاد کی کوئی اب تیا نہیں اُت دا دھبی فریاد کی
 آنکھ میں آنسو بھر ہیں دل ہے کھٹلایا ہوا ریشہ بر اندام ہے اور خوف ہے چھایا ہوا
 رات ہے بھیگی ہوئی اور باد کرتے ہیں سبق نیند آنکھوں میں بھری ہے اور اُلٹتے ہیں ورق
 کاغذی ہے تیرا پیرا ہن ایسے اور وسیاہ دیتی ہیں لفاظیاں تیری فریبِ عز و جاہ
 لن ترانی ہانک کر خاموش جب ولت ہوئی^(۳) کلفشاں اس وقت یوں تعلیم پر جدت ہوئی
 ہوش کے ناخون لے او بے وفا او بے شعور ناز بیجا ہے ترا، اچھا نہیں اتنا عسور
 سُر خروئی کا تری گواک جہاں گرویدہ ہے اصل میں تو پر تو دستِ خا مالیدہ ہے
 بے مروت، بد چلن، بد خو ہے ہر جانی ہے تو نیند میں ڈوبی ہوئی غفلت کی انگڑائی ہے تو
 خود غرض ہے مطلبی ہے طبع من بانی تری ہے تیری رگ لگ سے ظاہر خار دامانی تری
 خوشنائی تیری دیتی ہے فریبِ زندگی موت کا پیغام لاتی ہے تری تابندگی
 آنکھ پر غفلت کے پردے ڈالنے آتی ہے تو اور جھپکتے ہی نظر کا فور ہو جاتی ہے تو

ہر وفا تیری دغا بازی کی اک تھیس ہے خون میں ڈوبی ہوئی تو ماتی اک عید ہے
 روح ہستی کو تری تابندگی اک زہر ہے رخنہ اندازِ عناصر تیری ہر اک لہر ہے
 ہے نہاں رنگینوں میں فتنہ سامانی تری خار کا رید چمن ہے یہ گل افشانی تری
 سیل آنکھوں سے اڑاتی ہے مٹا کر اتفاق کشتِ زارِ دہر میں لڑتی ہے تو تخمِ نفاق
 تیری دورنگی کا شاہد تیرا دولت نام ہے خوشما آغاز ہے اور غمزدہ انجام ہے
 چشمِ مینا ہے اگر تو دیکھ میری رفعتیں ^(۴) نکتہ نکتہ سے عیاں ہیں کیسی کیسی جدتیں
 عقل افروزِ جہاں ہے فلسفہ دانی مری جگہ گاتی نورِ فطرت ہے پیشانی مری
 یہ بہارِ کاغذی میری نری گلپوش ہے ہوں تو قطرہ پر وہ قطرہ ہوں حج دریا دوش ہے
 ہے محیطِ بزمِ فانی چہرہ عسریانی مری نو چہرہ دہر ہے تاریک سامانی مری
 ابرو پائی جہاں نے میری بے آبی سے ہے حسنِ فطرتِ ضو فتال میری سیہ تابی سے ہے
 غیرتِ انجم ہے نکتہ دائرِ رشکِ ہلال میرا ہر اک لفظ ہے صہبائِ فطرت کا ذوال
 نبضِ ہستی کی تپش ہے میرا خونِ مشک بو انکساری میرا شیوہ عاجزی ہے میری خو

میرے پاؤں چومتی ہیں ولتیں کونین کی میرا صدقہ ہے ہر اک بہبودگی دایرین کی
 جس سے دُنیا جگمگا اُٹھی وہ میری ذات ہے جس کے منہ سے پھول جھڑتے ہوں میری بات ہے
 ہوں ذریعہ علم کا تسلیم میرا نام ہے رہبر تسلیم ہوں تفہیم میرا کام ہے

قطرہ ناچیز ہوں تفسیر عیش و غم ہوں میں

زینتِ پیشانی گل گوہرِ شبِ بنم ہوں میں

خواجہ محمد شمعون صاحبِ شبِ بنم

بازگشت

وہ خزاں کی آوارہ گرد ہواؤں کی طرح جنگلوں، وادیوں اور پہاڑوں کی طرف بھل چلا۔ اُس نے ماہ و سال کی تنویری سی گردشوں ہی میں اپنی زندگی کے بہت سے ہیجانوں کو آزمایا تھا اور خیال و احساس کی مختلف لذتوں سے وہ کامیاب ہو چکا تھا۔

اب اس کے لئے انسانوں کی قربت میں کمی کی کشش باقی نہیں رہی تھی۔

فطرت کی حسین دولتوں کو سمیٹنے کیلئے وہ اپنی نگاہوں کے دامنوں کو لئے ہوئے تن تنہا، سحر کی مہانی چھاؤں میں اپنے گھر سے نکل کھڑا ہوا اور شام کے جھپٹے میں ایک ایسے مقام سے گزرا جہاں ماہی گیروں نے اپنی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنا رکھی تھیں۔ اور دھندلے پانی ایک اونچے پہاڑ کے دامن میں آہستہ آہستہ جٹانوں سے ٹکرا رہے تھے۔ اُس نے خیال کیا آج کے لئے اتنا سفر کافی ہے۔ سفر کی پہلی رات اسی وادی میں بسر کی جائے اور صبح صادق کے ساتھ ہی کوہستانی سفر کا آغاز ہو۔ اُس نے اپنے ارد گرد کے منظر پر نگاہ ڈالی اور بالآخر ایک صاف اور مسطح چٹان پر اپنی سفید جاد بچھا دی۔ دریا کا پانی بھی اُس سے قریب تھا اور ماہی گیروں کی جھونپڑیاں بھی اُس کی نگاہوں کے سامنے۔ لیکن وہ خود اُن سب سے بہت دور تھا۔ وہ اپنی چادر پر لیٹ گیا۔ آسمان پر ستاروں کے چھٹ پڑے ہیں اُس کی نظر میں گم ہو گئیں اور ماضی کے دُھندلے نقوش میں اُس کے خیال کو گم کر رہ گئے۔ یہاں تک کہ اُس کی آنکھوں میں پہاڑوں اور وادیوں کی میٹھی نیند میں سما گئیں۔ وہ سو گیا لیکن اُس کا احساس رات بھر بیدار رہا اور اُس کا سبک پرواز تصور اُسے اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرتا رہا۔ پہلے وہ اُس کو ایک پڑائے کھنڈر میں لے گیا جہاں اُس نے اپنے سب سے ابتدائی مکان کے ستونوں اور دروازوں کو دیکھا جو اب تک ایک باوقار انداز کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر قائم تھے لیکن مکان کی چھتیں اور دیواریں سرنگوں تھیں۔ پھر بھی اُس نے اپنے کمرہ کی جگہ کو پہچان لیا اور بڑے شوق اور اطمینان کے ساتھ اُس میں داخل ہو گیا۔ اُس کو صاف نظر آ رہا تھا کہ اُس کی الماری، میز، آرام گریں اور تمام دوسری چیزیں اپنی اپنی جگہ پر قرینے سے رکھی ہوئی ہیں۔ وہ اپنی تمام چیزوں کا جائزہ لینا چاہتا تھا وہ چاہتا تھا کہ اپنے

کمرہ میں ہمیشہ کے لئے رہ جائے اور بچپن کے محبوب مشاغل میں اپنا تمام وقت اس طرح صرف کر دے جیسے کہ وہ اُس کی ایک لازوال ملکیت ہے لیکن وہ کسی غیر اختیاری اور نامعلوم قوت کے زیر اثر دوسرے دروازہ سے یکایک باہر نکل گیا۔ اور پھر وہ بہت جلد ایک عالیشان محل میں داخل ہوا۔ یہاں وہ بڑی دیر تک ٹھہرا۔ پائین بلغ میں گھومتا رہا۔ حوض کے کنارے اُس مقام پر پہنچا جہاں سب سے پہلے اُس نے حسن و محبت کی اولین نظروں کا پُرشوق اور بے تابانہ خیر مقدم کیا تھا اور پھر وہ اُن ایوانوں میں پہنچا جہاں کبھی رنگ و نکمت کے بہت سے متحرک گلہ ستے اُس نے اپنے ذوق اور مذاق کے مطابق سجائے تھے لیکن اس وقت وہ اُن کے پاس ایک لمحہ کے لئے بھی نہ ٹھہرا اُس کا بے اختیار جی چاہا کہ پھر اُسی کُنچ کی طرف چلا جائے جہاں اُس نے سب سے پہلے اپنے لئے ایک حسین و رنگین پھول انتخاب کیا تھا اور ابھی وہ اُسے توڑنے بھی نہ پایا تھا کہ رنگ و نور کے سیلاب نے اُس کے ارادوں کو متزلزل کر کے رکھ دیا تھا۔ بہر حال وہ جلد جلد وہاں سے گزر گیا، ایرانی قالینوں اور نرم و گداز صوفوں کے پاس سے ہوتا ہوا وہ باہر نکل آیا اور ایک شاہراہ کو طے کر کے ایک بہت بڑی عمارت کے دروازہ پر آکر رُکا جہاں طرح طرح کے انسانوں کا ہجوم تھا لیکن اندر وہی داخل ہونے پاتا تھا جس کے پاس داخلہ کا ٹکٹ موجود ہوتا۔ اُس نے اپنی عیبوں کو ٹھوٹا اُسکے پاس ویسا کوئی ٹکٹ موجود نہ تھا اس لئے اُس کو اندر جانے کی اجازت نہ ملی۔ بے انتہا مذمت اور مایوسی کے عالم میں وہ وہاں سے لوٹا اور تیزی کے ساتھ شہر بنیاد کی طرف دوڑا وہ شہر کو چھو کر باہر نکل آیا اور ایک جنگل کی طرف ہو لیا جہاں خشک ہوائیں چل رہی تھیں اور نیم برہنہ درختوں سے زرد زرد پتے برابر ہواؤں میں جھکے کاتے ہوئے زمین پر گر رہے تھے۔

تصور نے اُس کو یہاں تک پہنچا کر چھوڑ دیا۔ وہ بہت افسردہ اور غمگین ہو رہا تھا۔ ایک گرم گرم چمکتا ہوا آسمان کے رخسار پر ڈھلک کر رہ گیا۔ اُس کی آنکھ کھل گئی، سامنے آسمان پر سحر کا روشن ستارہ چمک رہا تھا۔ وہ گھبرا ہوا اٹھ بیٹھا اور دیوانہ وار پہاڑ کی طرف دوڑا۔ نیزاعظم کے طلوع سے قبل وہ پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی پر پہنچ چکا تھا وہ اپنی کامیابی پر خوش تھا۔ اس نے سوچا سورج زمین کے نیچے سے طلوع ہوگا اور میری باوقار زندگی کی صبح صادق پہاڑ کے پیچھے سے نمودار ہو رہی ہے۔ میں اس وقت سب سے بلند ہوں۔ نیزاعظم سے بھی بلند۔ آج سے میں سمندروں کو اپنے گریٹ سکھاؤں گا۔ ہواؤں کو اپنے نفوں میں بساؤں گا اور وادیوں اور پہاڑوں کو اپنے گلہائے سخن سے سجاؤں گا۔ وہ سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ اُفی مشرق میں شریوں کی لہریں دوڑ گئیں اور نیزاعظم نے انہیں لہروں میں سے مسکراتے ہوئے اپنا سر بلند کیا۔ صباح کی سُمائی روشنیاں ساری فضا میں پھیل گئیں۔ اور اس وقت اس نے ایک نیا گیت تصنیف کیا اور اُس کو گاتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ اب ماہی گیروں کی جھونپڑیاں اُس کی نگاہوں سے

اوجھل ہو چکی تھیں اور بستی کا منظر بھی پہاڑ کی بلندیوں کی آڑ میں اُلگیا تھا۔ وہ ایک گھنے درخت کے قریب پہنچ کر اُس کی ٹھنڈی چھاؤں کے تلے اُس نے اپنی چادر بچھا دی اور ستر اور کیف میں ڈوب کر اُس نے اپنا سب سے زیادہ لطیف و دلکش گیت تصنیف کیا جس کا مطلب کچھ اس طرح تھا کہ :-

”خواب کی انتہائی مستیوں اور مدہوشیوں کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کا سفر شروع کیا اور بیداری کی اولین شاعری کی آغوش میں اس کو ختم کر دیا۔ میں نے اپنی منزل کو پایا، اپنے مقصود کو حاصل کر لیا۔ میں خوش ہوں اور مطمئن ستاروں کی طرح خوش اور مطمئن۔ اور اب میں بیداری جاوداں کی اس متاع گراں مایہ کو کسی قیمت پر بھی اپنے پاس سے جدا نہ کروں گا“

کتنے دن اسی طرح گزر گئے۔ ہر صبح اُس کے لئے اپنے ساتھ ایک گیت لاتی اور ہر شام نغموں کا ایک رنگین عنوان اُس کے لئے چھوڑ جاتی۔ اُس کی نیندیں بھی بیداری سے لبریز ہوتیں اور اُس کی مستی کے لمحے بھی علم و شعور سے معمور ہوتے۔ آخر ایک رات ایسی بھی آئی کہ اُس پر نیند کا ایک ایسا شدید غلبہ طاری ہوا کہ بیداری کا دامن اُس کے ہاتھ سے چھوٹنے لگا وہ گھبرا کر بے اختیارانہ پہاڑ سے نیچے اترنے لگا۔ وہ پھر دامن میں پہنچ گیا۔ دور سے ماہی گیروں کی جو بوٹیاں ستاروں کی چھاؤں میں دُھندلے دھبوں کی طرح نظر آ رہی تھیں وہ دوڑتا جا رہا تھا۔ تیزی سے بستی کی طرف اُس کے قدم اٹھ رہے تھے۔ وہ دھجھرائیوں کے ہجوم میں کھوجانا چاہتا تھا یعنی وہ پھر ایک دفعہ سو جانا چاہتا تھا۔ ایک ابدی نیند، ایک جاودانی خواب۔ اب اُس کی یہی آرزو تھی۔ فیصلہ شہر کے قریب پہنچا تو اُس کو اپنے اُس پھول کا خیال آیا جس کے رنگ و بو نے سب سے پہلے اُس کے احساس و شعور کو متاثر کیا تھا۔ وہ اُسی کچھ کی طرف چلا اور راستہ میں اس نے ایک نیا گیت بنایا جو اس کا آخری گیت تھا اور اُس میں اُس نے لکھا کہ :-

”شکر یہ ادا کرتا ہوں اپنے باغِ حیات کے اُس سدا بہار پھول کا جس نے کبھی میری زندگی کو معطر اور منور نہ کیا تھا اور آج پھر میں بیداری جاوداں کے قریب سے بچکر بیتاب و مضطرب اُسی کی جانب جا رہا ہوں تاکہ اُس کے دامن کی بو بکھیرے وہ خواب عطا کریں جو رشکِ صد بیداری ہوگا۔“

حسن
اختر علیہ السلام - اے

طالب علم سے خطاب

حسن و جمالِ حور میں ساری فضا ئے نور میں
وادیِ قدس و طور میں حشر میں نفعِ صو ر میں
ریح و عزم و سرور میں عقل و حس و شعور میں
سارے قریب و دور میں سارے خفا و ظہور میں
کون و مکاں کے جبریل
تو ہے کہاں کہاں دخیل

دل کے ارادیا ت میں لفظ کے معجزا ت میں
وہم و تخیلا ت میں عقل کے مدِ کات میں
کشمکشِ حیا ت میں دغدغہٴ ممات میں
سارے تغیرا ت میں ہستی کا مُنا ت میں
کون و مکاں کے جبریل
تو ہے کہاں کہاں دخیل

عقل کو تجھ سے امتیاز علم کو تجھ پر فخر و ناز
نغمہٴ زندگی کے ساز روح کو تجھ سے ہے نیاز
ہستی دہر کا ہے راز تیرا وجودِ دل نواز
درکِ حقیقت و مجاز دونوں سے تو ہے سرفراز

کون و مکاں کے جبرئیل
تو ہے کہاں کہاں ذخیل

طالب علم کا خطاب	تیسرا خطاب لا جواب
بچہ سے خطا کا ارتکاب	موجب رحمت و ثواب
تیری تلاش کا میاب	اوج و عروج کا شباب
قلزمِ علم کے حباب	تو ہے جہانِ انقلاب

کون و مکاں کے جبرئیل
تو ہے کہاں کہاں ذخیل

روح کے انبساط میں	جسم کے ارتباط میں
قوم کے انضباط میں	قوت و انحطاط میں
سقف و در و رباط میں	دائرہ و نقاط میں
نفرت و اختلاط میں	عقل کی احتیاط میں

کون و مکاں کے جبرئیل
تو ہے کہاں کہاں ذخیل

صوفی با صفا کہیں	مردِ رہِ خدا کہیں
عجز کا اقتضا کہیں	خودِ سر و خود نما کہیں
موردِ ابتلا کہیں	نفس کا ارتقا کہیں
فلسفہ بہتا کہیں	راہِ روِ رضا کہیں

کون و مکاں کے جبرئیل
تو ہے کہاں کہاں ذخیل

بچہ سے حیاتِ نامیات	بچہ سے بقائے صالحات
تو ہے بیطِ شش جہات	بچہ سے نمود کائنات
تو ہے وہ مظہر صفات	جو ہے دلیلِ عین ذات
ذہنِ رسا کا التفات	بر ترِ کل تقیّات

کون و مکاں کے جبرئیل
تو ہے کہاں کہاں ذخیل

عرصہ ممکن و محال منکر رسا کا پاٹمال
تیری بسندی خیال برتر حدِ قیل و قال
منظرِ شانِ ذوالجلال تو ہے وہ صاحبِ کمال
تجھ کو دکھا سکیں زوال ارض و سما کی کیا مجال

کون و مکاں کے جبرئیل
تو ہے کہاں کہاں ذخیل

رازِ عبودیت ہے تو شانِ الوہیت ہے تو
روحِ طفولیت ہے تو فیضِ ربوبیت ہے تو
تاجِ ملوکیت ہے تو ضدِ قنوطیت ہے تو
شرحِ عمومیت ہے تو عینِ خصوصیت ہے تو

کون و مکاں کے جبرئیل
تو ہے کہاں کہاں ذخیل

اے کہ مال ملک تو مال و منال ملک تو
حسن و جمال ملک تو جاہ و جلال ملک تو
رفعت حال ملک تو عین کمال ملک تو
ہو کے و بال ملک تو بن نہ زوال ملک تو

کون و مکاں کے جبرئیل
تو ہے کہاں کہاں ذخیل

نفس کی اپنے معرفت عین دلیلِ عبدیت
فرض ہے فرق مرتبت اپنے بڑوں کی منزلت
امن و امان مملکت خدمت خلق و سلطنت
خوفِ خدا و آخرت شکرِ عطا و مکرمیت

کون و مکاں کے جبریل
تو ہے کہاں کہاں ذیل

خلق میں استوار بن خلق میں کامگار بن
طینت خاکسار بن عظمت پائدار بن
خرد ادب شعار بن نازش روزگار بن
بادہ خوشگوار بن مستی چشم یار بن
کون و مکاں کے جبریل
تو ہے کہاں کہاں ذیل

امر خدا کا امثال تجھ پہ ہے فرض بے مقال
چون و چرا کا اختلال نفس کے مکر کا ہے جال
دیکھ بچا کے بال بال چونک کہ آگیا و بال
اس کا رہے سدا خیال خود یہ نہ بھٹی تری مجال
کون و مکاں کے جبریل
تو ہے کہاں کہاں ذیل

حکیم خواجہ محمد اسماعیل عفی عنہ فریج

مشاہیر کے آخری الفاظ

سکندر اعظم | سکندر اعظم جس نے ساری دنیا کو ہلا دیا تھا اور جس نے لاکھوں انسانوں کا خون بہایا تھا۔ جب موت سے ہم آغوش ہوا تو اس نے کہا شروع کیا :-

”میں دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا مگر موت نے مجھے فتح کر لیا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے کتنے انسانوں کا خون بہایا ہے اور میں کیا لیکر جا رہا ہوں۔ افسوس کہ مجھے زندگی کا وہ سکون بھی حاصل نہ ہو سکا جو ایک معمولی انسان کو حاصل ہے۔ اچھا ہوا کہ میں دنیا فتح نہ کر سکا۔ اگر میں دنیا فتح کر لیتا تو اس سے زیادہ کچھ نہ حاصل ہوتا کہ اپنے گناہوں میں اور اضافہ لیکر دنیا سے جاتا۔ مجھے فوجی لباس میں دفن کرنا کیونکہ میں سپاہی تھا اور سپاہی ہوں۔“

یہیں اُس سکندر اعظم کے مایوسی میں ڈوبے ہوئے الفاظ جو کروڑوں انسانوں کی جانوں کا مالک تھا۔
 نپولین اعظم | نپولین جس نے انتہائی مایوسی میں جان دی اور جس نے سینٹ ملینیا میں قید رہ کر دنیا کو دکھا دیا کہ گوش ہر حال میں جاری رہ سکتی ہے اس کے الفاظ سکندر اعظم سے بھی زیادہ دردناک تھے۔ اس نے مرنے کے وقت کہا تھا کہ :-
 ”مایوسی میرے نزدیک گناہ تھی۔ مگر مجھ سے زیادہ مایوس انسان کوئی دنیا میں نہیں ہے۔ میں دنیا میں دو چیزوں کا بھوکا تھا۔ ایک حکومت دوسرے محبت کا۔ حکومت مجھے ملی مگر وہ میرا ساتھ نہ دے سکی۔ محبت کو میں نے بہت تلاش کیا مگر اسے حاصل نہ کر سکا میں نے جس سے محبت کی اس نے مجھے دغا دی۔ شاید محبت کا جواب دغا ہی ہوتا ہے اگر کسی انسان کی زندگی کا یہ مقصد رہا ہے تو وہ زندگی بے معنی ہے۔ میرے نزدیک دنیا مایوس ہے اور مایوسی ہی نام دنیا ہے۔“

یہیں اُس نپولین کے الفاظ جس نے سارے یورپ کو ہلا دیا تھا اور جسے آج بھی دنیا کی تاریخ میں ایک امتیازی درجہ حاصل ہے۔

ہارون الرشید | خلیفہ ہارون الرشید طوس میں بستر علالت پر پڑا ہوا تھا۔ موت گھیرے ہوئے تھی اس نے

اسی مکان میں جس میں وہ ٹھہرا ہوا تھا اپنی قبر کھدوائی جب قبر کھد کر تیار ہو گئی تو اس نے اپنی چار پائی قبر کے کنارے پر بچھوائی اور بڑے بڑے قبر کو دیکھتا رہا۔ مارون کی زبان سے یہ الفاظ نکلے :-

”لوگو گواہ رہنا کہ میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں اور رسول اللہ کی رسالت کا سچے دل سے قائل ہوں۔ میں ایک معصیت اور گناہ کا پیکر ہوں جس نے ساری عمر غم غلط کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں پھر بھی غم غلط نہ کر سکا میں نے بے حد غم اور فکر مندی کی زندگی گزاری۔ حکومت کے کاموں اور حکومت کی لعنتوں نے مجھے اکثر خدا اور مذہب سے غافل رکھا ہے خدا مجھے معاف کرے۔ مجھے زندگی کا کوئی دن ایسا یاد نہیں ہے جو میں نے بے فکری کے ساتھ گزارا ہو۔ اب میں موت کے کنارے پہنچا ہوں۔ موت تم سب سے جدا کر دیگی اور یہ قبر جو اس وقت مسخ کھولے ہوئے سامنے ہے میرے جسم کو نگل لے گی۔ یہی ہر انسان کا مال ہے مگر انسان اپنے مال سے میری طرح غافل رہتا ہے۔“

پھر اس نے کچھ حکومت کے انتظامی معاملات میں مشورے دئے۔ اس کے بعد خلیفہ کا چراغ حیات گل ہو گیا۔

عبدالملک مدائنی کہتے ہیں کہ جب عبدالملک کو اپنے مرنے کا یقین ہو گیا تو اس نے کہا :-

”جب سے میں پیدا ہوا ہوں مجھے ہی آرزو رہی کہ میں اپنے آپ کو کسی طرح سے مسرور کر سکوں لیکن مجھے کبھی سچی مسرت حاصل نہیں ہوئی۔ میں نے حکومت کا بوجھ اپنے سر اس لئے لیا تھا کہ میں سمجھتا تھا کہ بادشاہت انسانی ترقی کا معراج ہے مگر مجھے دھوکا ہوا۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اور میں کرتا رہا ہوں اس پر نادم ہوں مگر ندامت کا وقت گزر چکا ہے اور میں ناکام اور نامراد دنیا سے جا رہا ہوں۔ میں نے جو راستہ اپنے لئے منتخب کیا تھا وہ غلط تھا۔“

یہ ہیں الفاظ اس عبدالملک کے جس کی خلافت میں حجاج نے خانہ کعبہ پر حملہ کیا۔ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے افعال پر نادم تھا اور موت کے وقت اسے اندازہ ہوا کہ حکومت ایک بے معنی چیز ہے۔ (ماخوذ)

محمد اسد اللہ متعلم جماعت ہیم (سی)
عثمانیہ ورنگل کالج

گلِ شاداں

اب بھی شاداں وفا ہے دلِ شادابِ مرا

کہیں طغیانِ تغافل نہ اُسے مُرجھا دے اور شرمندہٴ لغیر رہے خوابِ مرا
جز وفا کوئی مرعشت کی منزل ہی نہیں اک امانت، تمہاری یہ مراد دل ہی نہیں
آؤ اپنے گلِ شاداں کو نہ مُرجھانے دو دھونڈتا ہے تمہیں ہر لمحہ بیتابِ مرا

اب بھی شاداں وفا ہے دلِ شادابِ مرا

روش صدیقی

ہزہائیںس سر آغا خان

آبا و اجداد | ہزہائی نس، نبی آخر الزماں حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے ہیں۔ حضرت علی کریم اللہ وجہ کے جانشینوں میں سے حضرت امام جعفر صادق نے ترکی میں حکومت کی

اور وہاں حالات ناسازگار ہوئے تو یہ تخت مصر پہنچا۔ اور وہاں ڈھائی سو سال تک چٹھے امام سے انیسویں امام رحمۃ اللہ علیہ تک حکومت کرتے رہے۔ یہاں سے امامت کی گدھی ایران منتقل ہوئی حضرت محمد کے زمانہ میں سنن نامی ایک سپہ سالار نے غازی صلاح الدین کو کسی موقع پر فوجی امداد دی تھی جس کے عوض سلطان نے اپنی ملکیت میں تبلیغ فرقہ اسماعیلی کی اجازت دی۔ اس طرح اس فرقہ کو روز افزوں ترقی ہوئی گئی حضرت حسین علی شاہ چچیا لیسویں امام نے شاہ فتح علی شاہ ایران کی لڑکی سے شادی کی۔ آپ کی خدمات کے صلہ میں سلطان ایران نے آپ کو آغا خاں کا خطاب دیا۔ آپ ایران سے افغانستان اور بلوچستان ہوتے ہوئے اپنی چھوٹی سی فوج کے ساتھ ہندوستان آئے اور یہیں بس گئے۔ اس زمانہ میں آپ نے انگریز جنرل سر چارلس نیپیر کو تال پور کی باغی سلطنت کے مقابلہ میں امداد دی۔ جس میں آپ کے پانچ سو وفادار اور بہادر سپاہی کام آئے۔ اس گراں بہا امداد کے صلہ میں حکومت ہند نے آغا شاہ حسین علی کو ہزہائی نس کے آبائی خطاب سے سرفراز کیا۔ آپ کی وفات پر آپ کے صاحبزائے آغا علی شاہ گدھی نشین ہوئے۔ حکومت نے آپ کی خدمات کو بھی سراہا اور مجلس مقننہ بمبئی کے پہلے رکن کی حیثیت سے نامزد کیا آپ کے بعد حاضر امام سر سلطان محمد شاہ آغا خاں گدھی پر متمکن ہوئے۔ جو آج اسماعیلی عالم کے ابراہامیوں^{۲۸} امام ہیں

ابتدائی حالات | ہزہائی نس ۲۵ ماہ شوال ۱۲۹۲ھ مطابق ۲ نومبر ۱۸۷۵ء کو محمد ٹیکہ سی (کرچی) میں تولد ہوئے۔ آپ کے دو بڑے بھائی تھے لیکن ان کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا

اس طرح آپ اپنے والدین کے اکلوتے اور چھپتے صاحبزائے رہے۔ آپ کی والدہ ایران کے شاہی خاندان کے مشہور فلسفی نظام الدولہ کی صاحبزادی اپنے والد کی طرح خود بڑی عالم تھیں۔ ہزہائی نس کی ابتدائی تعلیم و تربیت

آپ ہی کی توجہ کا نتیجہ ہے۔ آپ کی تعلیم کا انتظام گھری پر ہوا۔ آپ کسی مکتب یا مدرسہ میں نہیں ٹھہرائے گئے۔ چونکہ آپ کا ذہن بہت تیز تھا۔ اس لئے چند ہی دنوں میں عربی، فارسی اور انگریزی میں غیر معمولی استعداد پیدا کر لی بعد کو آپ نے کئی یورپین زبانیں سیکھیں جن میں آپ بے تکلف گفتگو فرما سکتے اور قلم برداشت کر لکھ سکتے ہیں۔ ڈھائی برس کی عمر سے آپ نے کھیلوں میں دلچسپی یعنی شوق کی۔ جانوروں سے آپ کو بہت پیار تھا اور اب بھی ہے آپ کے صلیب کے گھوڑے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ہر مرتبہ ڈربہ کی ریس میں آپ کو کوئی نہ کوئی انعام ملتا رہتا ہے آپ کے گھوڑے بہنم۔ محمود اور بہرام نے لاکھوں روپیہ جیتے ہیں۔ گھوڑے کی سواری کا آپ کو بہت شوق ہے بچپن ہی سے یہ آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔ اپنے ساتھیوں میں ہمیشہ آپ کو سرگروہ کی حیثیت حاصل رہی۔ آپ لیڈر بن کر ہر معاملہ میں ان کی رہنمائی کرتے۔ غرض ہونا ہر دے کے چلنے چلنے پات۔ بچپن ہی سے آپ میں وہ سارے آثار نظر آ رہے تھے جو ایک ممتاز شخصیت کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ یہی دیکھ کر آپ کے والد نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ جوں جوں دن بیتے جائیں گے اس ہیرے کی چمک دمک بڑھتی جائے گی۔

حاضر امام کی حیثیت ۱۸۸۵ء میں والد کے انتقال پر آٹھ سال کی عمر میں آپ نے امامت کی گدی کو رونق بخشی اور اتنی سی عمر میں اپنے فرائض کو محسوس کرنے لگے۔ جب آپ نے گدی نشین ہو کر اپنی جماعت کو دست بوسی کا موقع دیا تو بعض بڑے بڑے علمداروں کی آنکھوں میں متونی امام کی یاد میں آنسو بھر آئے۔ آپ نے اس نوعمری میں جماعت والوں سے فرمایا: ”تم لوگ دلیکیر کیوں ہوتے ہو۔ تمہارا امام تمہارے درمیان بیٹھا تمہاری مرادیں پوری کر رہا ہے۔“ یہی نہیں بلکہ اس کے بعد آپ نے ہر ممکن ذریعہ سے اپنی جماعت کی ترقی کی کوشش کی۔ اور ایسے ایسے فرامین نافذ کئے جو آپ کی روشن دماغی اور اعلیٰ قابلیت کی دلیل ہیں اسماعیلی فرقہ کے لوگ ہندوستان، تبت، عرب، افریقہ اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جو آپ کو نہ صرف اپنا دینی رہنما سمجھتے ہیں بلکہ دنیوی لیڈر اور سرگروہ کی حیثیت سے بھی آپ ان کے کرتادھرتا ہیں۔

جشن زلیں ۲۱ جنوری ۱۹۳۶ء کو ممبئی میں اور اس کے ایک سال بعد ۱۹۳۷ء میں نیروبی جنوبی افریقہ میں آپ کی گولڈن جوبلی منائی گئی۔ ان دونوں مقامات پر آپ کو سونے میں تو لاگیا۔ ممبئی میں جب یہ رسم ادا ہوئی تو ممبئی ایک کرہ نامعلوم ہوتی تھی۔ رنگ برنگی جھنڈیوں اور برقی قمقموں نے ایک عجیب عالم پیدا کر دیا تھا۔ مسرت اور شادمانی کی فراوانی تھی۔ اسماعیلیوں کے علاوہ ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگ موجود تھے۔ جشن کے پہلے دن ہزارائی نس کو سونے میں تو لاگیا جس کا وزن (۹۷۱۴) تولے ہوا۔ آپ نے انتہائی فیاضی سے یہ رقم اپنے فرقہ کی ترقی کے لئے دیدی۔ رنگ رلیاں، تمنائیں اور سرتیں اپنے شباب پر تھیں کہ جشن کے دوسرے دن

شہنشاہ جارج پنجم کی رحلت کی خبر ملی۔ ہزہائیس نے حکم دیا کہ راگ و رنگ شان و مطہر کی ساری چیزیں یک لخت بند کر دی جائیں۔ اللہ اللہ یا تو مسرت و شادمانی کا وہ عالم تھا کہ ممبئی جنت ارم اور فردوس زمیں بنی ہوئی تھی یا اپنے امام کے حکم کی تعمیل میں ایک دم خزن و ملال کی فضا پیدا ہو گئی۔ فساد کی اور غم و الم کی دیوی نے اپنی تیرہ و تار نایس پھیلا دیں میں نے اپنی آنکھوں سے چل پہل اور ماتم کی یہ فضا میں دیکھی ہیں۔ مجھے وہ سا کبھی نہ بھولے گا جبکہ دیکھتے دیکھتے ترانہ بہار نعمۃ الم میں تبدیل ہو گیا۔ ایک ہی ساز کے تاروں نے آن کی آن میں اپنا راگ بدل دیا۔

خانگی زندگی جنوری ۱۸۹۷ء میں آپ کی پہلی شادی اپنے چچا جنگی شاہ کی صاحبزادی شہزادی بیگم سے ہوئی ۲۱ سے ۲۵ جنوری تک یہ تقریب بڑی دھوم دھام سے ادا ہوئی۔ سارے اعلیٰ عالم کی نمایندگی کی گئی تھی۔ اور شہر لوہا نعلیوں کی کثرت اور اپنی سجاوٹ کی وجہ سے دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

تیس سال کی عمر میں پہلی بیگم کے انتقال پر ۱۹۰۵ء میں پرنس تھیری سی سے مصر میں دوسری شادی ہوئی جس کے رسومات انتہائی سادگی سے ادا کئے گئے پرنس تھیری سی کے بطن سے ۱۳ جون ۱۹۰۵ء کو اٹلی میں پرنس علی سلمان خاں پیدا ہوئے۔ ۲ دسمبر ۱۹۲۶ء کو پرنس علی شاہ کی والدہ انتقال کر گئیں۔ موجودہ بیگم پرنس کیرون ہیں۔ پرنس صدر الدین آپ ہی کے لخت جگر ہیں۔

ہزہائیس ہمیشہ خوش و خرم رہتے ہیں۔ سویرے اٹھنے کی عادت ہے۔ ورزش کا بہت شوق ہے۔ آپ کی غذا بالکل سادہ ہے۔ تازہ مچھلی اور میو بہت پسند کرتے ہیں۔ چھاج پینے کا بھی شوق ہے۔ سیر و تفریح آپ کا محبوب مشغلہ ہے اور گولف دلپسند کھیل۔ اکثر صبح کے وقت آپ گولف کھیلنے نظر آتے ہیں۔

اخلاق اور کردار آپ بہت وسیع الخیال اور روشن دماغ ہیں۔ ابتدا ہی سے نیک دل اور سادہ مزاج واقع ہوئے ہیں۔ ہر انسان سے چاہے وہ کسی مذہب و ملت کا کیوں نہ ہو آپ کو ہمدردی ہے۔

آپ نے نوع انسان کی بھلائی کیلئے بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں جن کا ذکر آگے آریگا۔ ہر علم دوست اور قابل شخص سے آپ کو محبت ہے۔ آپ اہل علم و فضل کو اکثر اپنے ہاں مدعو کرتے رہتے ہیں۔

سیر و تفریح تجربہ کی خاطر آپ نے دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کا سفر کیا ہے اور مختلف ممالک کا گہرا مطالعہ کیا ہے سفر کے دوران میں آپ نے سلطان ترکی، شہنشاہ ایران، بادشاہ مصر، والی زنجبار اور زائرہ اور دیگر کئی مشاہیر سے ملاقاتیں کیں۔ ہر جگہ آپ کی آؤ بھگت کی گئی۔ سلاطین ترکی، ایران اور زنجبار نے آپ کی کئی اعزازات دیئے اور آپ کی خدمات کو بظرافت ستیمان دیکھا۔

علوم و فنون مختلف ممالک کے ادب اور علوم و فنون سے آپ کو گہری دلچسپی ہے۔ عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی

اور کئی یورپین زبانوں کے آپ ماہر ہیں۔ فلسفہ - مذہبیات اور سیاسیات سے آپ کو خاص شغف ہے۔ حافظہ - سعدی اقبال - شکسپیر - ملکن - تمکالے اور سکاٹ آپ کو بہت پسند ہیں۔ دن کا بڑا حصہ مطالعہ ہی میں صرف کرتے ہیں۔ اہم سیاسی اور معاشرتی مجلسوں میں ہمیشہ حصہ لیتے رہتے ہیں۔ اکثر ادبی اور سیاسی انجمنوں کے آپ صدر رہ چکے ہیں اور اب بھی متعدد انجمنوں کی سرپرستی کرتے ہیں۔

مدربر کی حیثیت سے انہیں ایک مدربر اور سیاسی کی حیثیت سے غیر معمولی پوزیشن کے مالک ہیں۔ گول میز کانفرنس میں شرکت کرنیوالوں میں آپ کی شخصیت بہت خاص تھی۔ جنگ عظیم کے بعد آپ کی ایک کتاب ”ہندوستان عبوری دور میں“ (*India in Transition*) شائع ہوئی تھی جس میں آپ نے مونٹ فرڈ اصلاحات سے قبل صوبہ جاتی حکومت اور وفاقی نظام کی اہمیت محسوس کرائی اور ہندوستان کیلئے ایک عمدہ اور اقلیتوں اور اکثریتوں کے لئے قابل قبول نظام حکومت بنانے کی تجویز پیش کی ہے انہیں نقوش پر بعد میں برطانوی حکومت نے قدم اٹھایا۔

خدمات اور عطیات آپ کی خدمات اور عطیوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ آپ ہمیشہ اپنے دود سے اپنی قوم ملک اور سارے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ امداد اور دستگیری کے وقت آپ ملک و ملت کی تخصیص سے ماورا ہو جاتے ہیں آپ کے پیش نظر صرف انسانی ہمدردی اور یہودی ہوتی ہے۔ یہی ۱۹۴۷ء کے غلط کے موقع پر آپ کی امداد اور خدمات کا حکومت ہند نے شاندار الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔ آپ نے کل ہندو مسلم تعلیمی کانفرنس کی صدارت کی اور تعلیمی ترقی کے لئے اپنی پوری کوششیں صرف کر دیں۔ علی گڑھ کالج کو مسلم یونیورسٹی کا درجہ دینے کے لئے انتہک کوششیں کیں۔ مولانا شوکت علی اور دوسرے اشخاص کے ساتھ سارے ہندوستان کا سفر کیا اور اپنے اثرات سے تیس لاکھ روپیہ کا خطیر جذبہ جمع کیا۔ نہ صرف یہی بلکہ خود اپنی جیب سے آپ نے سو لاکھ روپیہ کا گراں بہا جذبہ دیا۔ اس کے علاوہ اور کئی موقعوں پر آپ نے ہزاروں روپے علی گڑھ یونیورسٹی کو نذر کئے۔

جنگ عظیم میں آپ نے اپنی ساری قوتیں برطانیہ کیلئے وقف کر دی تھیں۔ ترکی جرمی کی طرف تھا۔ اسلامی دنیا کے ساتھ آپ کی ہمدردیاں بھی اسی کے ساتھ تھیں۔ ترکی کیلئے ایک موقع پر آپ نے چار کروڑ روپیہ کے گولہ بارود کا امریکہ کو آرڈر دیا تھا اور پھر بعد میں اپنے اثر سے آپ نے انگریزوں کے خیالات میں ترکی کی طرف سے بڑی تبدیلی پیدا کی۔

۱۹۴۷ء میں آل پارٹیز کانفرنس منعقدہ الہ آباد کی آپ نے صدارت فرمائی۔ مسلم لیگ کے جلسوں کی کئی مرتبہ صدارت کی۔ وفد خلافت میں شریک ہے۔ علی گڑھ کے وائس چانسلر اور پھر پروچانسلر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں ایم بی سی پیٹریٹ کونسل کی رکنیت پر فائز رہے۔ لندن مسلم لیگ کے جلسوں کی صدارت کے فرائض انجام دئے۔ ۱۹۳۷ء میں مجلس اوقاف

میں ہندوستان کی نمائندگی کی اور پھر اس کے صدر رہے۔ گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ غرض یہ کہ میسوں طریقے سے آپ نے ملک اور قوم کی خدمت کی اور ہر موقع پر اپنے ملک اور اپنی قوم کو فائدہ پہنچاتے رہے ہیں۔

آپ کے عطیوں کا شمار مشکل ہے۔ درپردہ اور چھپی ہوئی آپ نے سیکڑوں امدادیں کی ہیں۔ اگر آپ نے مسلم یونیورسٹی کو ہزاروں روپیہ کا چندہ دیا ہے تو پینڈت مالوی جی اور مہاراجہ درجھنگہ کی اپیل پر ہندو یونیورسٹی بنارس کی بھی ایک بڑی رقم سے امداد کی۔ سیڈن ایم کالج کے لئے دس ہزار روپیہ کا عطیہ دیا۔ فرگوسن کالج کو پانچ ہزار روپے دئے۔ جی۔ کے کو کھلے میموریل فنڈ کو آٹھ ہزار روپیہ کی رقم سے نوازا۔ ٹرانسوال فنڈ میں چار ہزار روپے دئے۔ ہندوستانی کرکٹ ٹیم کو ایک ہزار روپیہ دیا۔ ”بطانوی ہلال احمر“ کے ذریعہ ترکی کو (۳۰) ہزار فرانک روانہ کئے۔ اور ایک مرتبہ ایک فنڈ میں (۳۵) ہزار فرانک ترکی بچوں کی اعلیٰ نگہداشت کا انتظام کرنے کے لئے روانہ فرمائے۔ مسجد اقصیٰ کی تعمیر کے لئے جو وفد آیا تھا اسکی چار ہزار روپیہ سے امداد کی۔ نیروبی (افریقہ) کی مسجد کے لئے تیس ہزار روپیہ بھیجا۔ اپنی جماعت کی مذہبی۔ معاشرتی۔ تعلیمی اور سیاسی ترقی کے لئے ۵۵ لاکھ روپیہ سالانہ کی مستقل امداد مقرر کی اور غرض کہ یہ پوشیدہ طور پر بھی اور ظاہر بھی کیوں چندے اور عطیے دئے اور دیتے رہتے ہیں۔

اعزازات | ان عطیات اور خدمات کو بھلا حکومت اور قوم کس طرح فراموش کر سکتی تھی۔ دونوں نے جی کھول کر ان کی داد دی۔ حکومت نے ہزائینس P.C., G.C.V.O., G.C.I.E., G.C.S.I. کے اور جامعوں نے (م۔م۔م۔) خطابات اور ڈگریاں دیں۔ انہوں نے سلامی کا اعزاز بخشا۔ لاہور میں مسلم لیگ کے جلسہ کے لئے آئے تو لوگوں نے ان کی گاڑی کھینچی۔ ویسٹرن اسلامی ایسوسی ایشن نے گارڈن کی مسجد کا نام آغاخان مسجد رکھا۔ انیس برس ہی کی عمر سے آپ کو انگلستان کے شاہی مہمان کا درجہ حاصل ہوا۔ مختصر یہ کہ ہر جگہ کامیابی نے آپ کے قدم چومے اور اعزازات نے آپ کا استقبال کیا۔

حسین علی متعلم سال دوم کلیہ ونگل

تبرکات

از مولانا حسرت موہانی بی۔ اے (علیگ)

یہ غزل جہاز اسپر و زا از پروتا بزدلی پر ۱۶ ستمبر ۱۹۳۹ء کو لکھی گئی
 رعنائی میں حصّہ ہے جو قبرص کی پری کا
 رفتار قیامت یونہی کیا کم ہتی پھر اُس پر
 اک طرّہ ہے فتنہ تری نازک کمری کا
 باعث نہ یہی شوق کی ہوں جامہ درمی کا
 موجب ہے مگر زہد کی عصیاں نظری کا
 کیا کہئے جو ہے حال مری بخیری کا
 عالم ہے عجب شوق کی آشفۃ سری کا
 لا اریب کہ اُس حُسن ستمگار کی شرخی
 با وصف تلاش اُن کی خبر کچھ بھی نہ پا کر
 جب سے یہ سنا ہے کہ وہ ساکن ہیں ہیں کے

ساتھ اُن کے جو ہم آئے تھے تیر وقت حسرت

یہ روگ نتیجہ ہے اسی ہم سفری کا

یہ غزل بمقام روم ۱۹ ستمبر ۱۹۳۹ء کو لکھی گئی۔

ہم رات کو اٹلی کے حسینوں کی کہانی
 آنکھوں کا بستم تھا مرے شوق کا موجب
 سُنّتے رہے رنگینی ژوپا کی زبانی
 چتون کی شرارت ہے مری دشمن جانی
 ہونٹوں کے قریب آئی جو وہ زلف مغنبر
 ہوتی جو خبر اس کو تو کیا کیا نہ بکڑتی
 جھٹ جوم لیا ہم نے طبیعت ہی نہ مانی
 ژوپا نے غنیمت ہے کہ یہ بات نہ جانی

اٹلی میں تو کیا میں تو یہ کہتا ہوں کہ حسرت

دُنیا میں نہ ہو گا کوئی اس شکل کا ثانی

خطبہ افتتاحیہ انجمن اتحاد طلبہ وزنگل کالج

(ازعالیجناب محمد حسین خاں صاحب پرنسپل کلیئہ وزنگل)

اراکین انجمن اتحاد !

میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک دستور سا ہو گیا ہے کہ یونین کے پہلے جلسہ کو پرنسپل مخاطب کرے۔ بد قسمتی کی بات ہے کہ یونین کا پہلا جلسہ سال کا اتنا عرصہ گزرنے کے بعد ہو رہا ہے۔

یہ بھی ایک بد فیصلی ہے کہ یہاں وزنگل میں ہمیں بآسانی ایسے اصحاب نہیں مل سکتے جو کوئی افتتاحی خطبہ دے سکیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہاں مقررین کا وجود نہیں، مقررین ہیں اور جہاں تک مجھے علم ہے ان کی کوئی کمی نہیں لیکن آپ کے کالج کے معیار کے جیسے تعلیمی ادارہ کے لئے جدا گانہ نوعیت کے اصحاب چاہئیں۔ ایسے لوگ جو صاف علم و فضل ہوں یا پھر ایسے اشخاص جو درس و تدریس کی دنیا میں کسی قسم کا کوئی امتیاز و مرتبہ رکھتے ہوں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ مستقبل میں اس موقع کیلئے ہر سال کسی نہ کسی ایسی موزوں سستی کو ہم فراہم کر سکیں گے جو کسی خاص موضوع پر اپنے وسیع علم سے اراکین انجمن اتحاد کو فیضیاب کر سکے۔ اور اس وقت تک ہم مکملہ خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ اپنا کام بدستور چلاتے رہیں گے۔

اس مرتبہ اس منصب کو ادا کرنے کے لئے جو مجھے آگے بڑھنا پڑا تو میں نے خیال کیا کہ آپ کے ساتھ مل کر مسئلہ تعلیم کے بعض پہلوؤں پر غور کرنے کے لئے یہ موقع بہت خوب ہو گا۔

آپ یہاں تعلیم پانے کے لئے آتے ہیں نہ صرف کسی امتحان کی تیاری کیلئے تھوڑی بہت مدد و رہنمائی حاصل کرنے۔ آپ کو تعلیم دینے کا مسئلہ کوئی آسان مسئلہ نہیں ہے۔ بیشک یہ مسئلہ زیادہ آسان ہو جاتا اگر آپ کے گھروں میں آپ کو عمدہ آداب و اطوار سکھائے جاتے اور آپ کے کردار کو سنو ارا جاتا لیکن ہندوستانی گھروں میں عموماً ایسا نہیں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ تعلیم یافتہ اصحاب بھی گھروں پر اپنے بچوں کو تربیت دینے میں دشواری محسوس کرتے

ہیں پس اگر اس منصب کو یہ درس گاہ بھی نظر انداز کرتی ہے تو پھر کوئی مقام نہیں رہتا جہاں اس نقص کی تلافی ہو سکے ہماری تعلیم کے اس پہلو سے اس درجہ تعاقب بتا گیا ہے کہ غالباً اسی کے باعث بعض نقائص میں ہم مشہور ہو گئے ہیں۔

ہم۔ چاہے مسلمان ہوں، خواہ ہندو یا عیسائی۔ کاہل، غیر پابندِ اوقات، بے ضابطہ اور بے اصول سمجھے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا کیا ہوا کام زیادہ اعلیٰ اہمیت کا نہیں ہوتا۔

معمولی مزدوروں ہی کی مثال لے لیجئے۔ جن لوگوں نے تقابلی مطالعہ کی زحمت اٹھائی ہے انہیں انوس کے ساتھ اس کا علم ہوا ہے کہ ہمارے ہاں کے مزدور کام کی جو مقدار پیش کرتے ہیں وہ مغرب کے ترقی یافتہ مزدوروں کے نصف کے برابر بھی نہیں ہوتی۔ اس کا سبب کیا ہے؟ مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ لیکن سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ غلط تربیت کے باعث ہماری زندگیوں میں باضابطگی پیدا نہیں ہونے پاتی۔ ہمارے پاس کام کرنے، کھانے اور سونے کے اوقات مقرر نہیں ہوتے۔ جو کام ہمیں کرنا ہوتا ہے اُس پر اپنی پوری پوری توجہ صرف کرنے اور اپنا سارا وقت اُسی کیلئے وقف کر دینے کے بجائے ہم سہل انگاری اور بیدلی کے ساتھ اُس کو انجام دیتے ہیں۔

غیر دماغی کام چونکہ اپنے اندر بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، اس لئے ہو سکتا ہے کہ اُس سے قومی مفادات کو زیادہ نقصان نہ پہنچے، لیکن دماغی کام کو اس ڈھنگ سے انجام دینا اس دو مصابقت میں اپنے ملک کو زبردست گھاٹے میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ اگر ان طریقوں کو ختم کرنا ہے اور صحیح اصولوں پر کام کرنا ہے تو اس کا آغاز ہمارے تعلیمی اداروں ہی سے ہونا چاہئے۔

اگر آپ نے وقت کی پابندی، باقاعدگی اور جی لگا کر ایسا انداز کے ساتھ کام کرنا یہاں نہ سیکھا تو میں نہیں سمجھتا کہ یہ چیزیں پھر آپ کہاں سیکھیں گے۔

اگر میں اصرار کروں کہ آپ اپنے اندر یہ صفات پیدا کیجئے۔ اگر آپ سے کہا جائے کہ اوقات کی پابندی فرمائیے نائنہ نہ کیجئے اور اپنے کام میں باضابطگی اور دیانتداری کو راہ دیجئے تو یہ کچھ میری خوشنودی کیلئے نہیں ہے۔ اگر آپ اوقات کی پابندی نہ کریں گے اور اپنے کام میں بے اصولی اور لاپرواہی رہیں گے تو نظامِ شمسِ توتہ و بالاہونہ جائے گا اور نہ آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اپنی آئندہ زندگی میں آپ ایک ناقابلِ اعتماد انسان بن کر رہ جائیں گے۔ جہاں تک اس کا بچ کا تعلق ہے ان امور کو اگر غیر اہم اور حقیر سمجھ لیا گیا تو حقیقی معنوں میں کسی عمدہ کام کا سرا انجام پانا ممکن ہی نہ ہو سکے گا۔

میں نے اوپر جن امور کا ذکر کیا ہے اُن میں ایک چیز یعنی وقت کی پابندی کو کتنی زبردست اہمیت حاصل ہے اس کا انکشاف مجھ پر گزشتہ جنگِ عظیم کے دوران میں ہوا۔ ۱۹۱۵ء میں میں لندن میں تھا اور زرش کی غرض سے میں

آپس میں دوستانہ بات چیت کر رہے ہیں۔

اگر اپنی آواز کے زیر دہم کا اندازہ آپ خود نہیں لگا سکتے اور اس فیصلہ پر نہیں پہنچ سکتے کہ کتنی زور سے آپ کو بات کرنی چاہئے کہ آپ کا مخاطب اُسے سُن سکے تو پھر سمجھنا چاہئے کہ آپ میں شے لطیف کی کمی ہے اس طرح آپ بے ضرورت اپنی توانائی کو ضائع کرتے ہیں جسے بہتر مقصد کے لئے صرف کیا جاسکتا ہے اور خود اپنے لئے بلائے جان بن جاتے ہیں۔ اگر آپ اپنی نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے تئیں کوئی نقصان نہیں پہنچا رہے ہیں تو اس کا حق آپ کو کہاں سے مل گیا کہ دوسروں کا بھی پاس و لحاظ نہ رکھیں! اس سلسلہ میں مجھے ایک اور بات یاد آگئی۔ چلا کر بات کرنے کے مجرم اکثر و بیشتر چھوٹے لڑکے ہوتے ہیں۔ لیکن اونچی جماعت کے بڑے لڑکوں میں یہ بیماری ایک نئے روپ میں نمودار ہوتی ہے۔ نویں اور دسویں جماعت کے بعض لڑکے ایک قطار میں چلنا اپنی کسر نشان سمجھتے ہیں وہ یا تو ذرا پیچھے رہ جائیں گے یا دو دو مل کر چلیں گے یا پھر بہت ہی دھیرے دھیرے قدم اٹھائیں گے۔ اگر وہ استاد سے قبل کلاس میں پہنچ جائیں تو آخر اُس میں نقصان کیا ہے؟ — اس کا ہرج نہیں کہ وہ کلاس میں دیر سے پہنچتے ہیں۔ بلکہ مضرت رساں چیز یہ ہے کہ ایسے لڑکوں کو نظم و ضبط کا کوئی پاس نہیں ہوتا۔ وہ امور کی انجام دہی میں انتشار و بے قاعدگی کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو اپنے دماغ 'اپنے اعضا و جوارح اور اپنے آپ پر کوئی قابو نہیں ہوتا۔ یہ بے ربط اور بے ضابطہ عادتیں جدھرے جاتی ہیں اُن کے نقشے آپ کو ہر طرف نظر آئیں گے۔

مہذب ممالک کے حالات سے اس کا مقابلہ اور موازنہ کیجئے۔ یہاں ہندوستان میں آپ کسی تھیٹر یا سرکس یا فٹ بال یا کرکٹ کے میچ میں جاسیے تو آپ کیا دیکھیں گے کہ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ گھس پل کر کسی نہ کسی طرح سب سے اچھی جگہ پر قابض ہو جائے۔ اُسے اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ اُس جگہ کے لئے زیادہ استحقاق رکھنے والے بھی موجود ہیں۔ اگر اُس سے چھوٹے اور کمزور لوگ اُس کے دھکوں میں آکر کنارے جا پڑتے ہیں تو اس کی بلا سے۔

کسی بڑے ریلوے اسٹیشن پر یا پھر کسی نئے کھیل کی پہلی رات کسی بڑے تھیٹر میں چلے جائیے اور لوگوں کے ٹکٹ خریدنے کا تماشہ دیکھئے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ سب سے پہلے ٹکٹ اُسی کو ملے، اس ریل پیل میں لوگ دبتے ہیں۔ دھکے کھاتے ہیں اور پریشان ہوتے ہیں لیکن کسی کو اس کی پروا نہیں ہوتی۔ یہ جنگل کا قانون ہے۔ مہذب دنیا کا قانون اس سے مختلف ہے۔ آپ انگلستان کے بڑے سے بڑے اسٹیشن پر چلے جائیے جہاں غالباً یہاں کے مقابلین بہت زیادہ لوگ ٹکٹ خریدنے کے منتظر ہوتے ہیں جو کوئی پہلے آتا ہے۔ چاہے وہ مرد ہو یا عورت یا بچہ۔ آگے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اُس کے بعد کا آنے والا اُس کے برابر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ دو دو مل کر اپنی ایک قطار بناتے چلے جاتے ہیں اور اگر کوئی اپنے زور بازو یا رتبہ کے گھمنڈ میں اس قاعدہ کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے تو سمجھئے کہ اس کی شامت

آئی۔ اگر وہ کہنے سننے سے راستی پر نہ آیا اور قانون کے توڑنے پر تُل ہی گیا تو سارا مجمع اُس سے سمجھ لیتا ہے۔

انگلستان میں فٹ بال اور کرکٹ کے بڑے بڑے میچوں کے موقعوں پر بعض اوقات اسی اسی ہزار کا مجمع ہوتا ہے لیکن اتنے کثیر لوگ نہایت ترتیب اور باقاعدگی کے ساتھ میچ دیکھنے جاتے ہیں اور جب میچ ختم ہونے کے بعد وہاں سے منتشر ہوتے ہیں تو اُسی ترتیب اور سلیقہ کے ساتھ۔ نہ کسی کی جان جاتی ہے اور نہ کسی کے زخم آتا ہے۔

ایسے زبردست مجھے یہاں بڑے بڑے میلوں ٹھیلوں کے موقعوں پر ہوتے ہیں جن میں کچھ لوگوں کا زخمی ہونا اور چند جانوں کا ضائع جانا ضروری ہے۔

اور اُگے بڑھنے اور انٹرمیڈیٹ کے ابتدائی اور آخری سال کے طلبہ کا جائزہ لیجئے۔

میں دیکھتا ہوں کہ اُن میں زیادہ تعداد ناکستہ لڑکوں کی ہوتی ہے لیکن ان میں سے بعضوں میں ایک نئی قسم کی بیماری پائی جاتی ہے۔ میں توقع نہیں کرتا کہ اعلیٰ جماعتوں کے لڑکے دیر حاضر، بکواسی اور بے ادب ہوں گے وہ ان منازل سے گزر چکے ہوتے ہیں۔ میں اسے تسلیم شدہ امر سمجھ لیتا ہوں کہ انھوں نے یہ ابتدائی چیزیں سیکھ لی ہیں لیکن اُن میں پُرانی بیماری ایک نیا روپ اختیار کر لیتی ہے اُن میں سے بعض تو اس قدر دھیرے دھیرے چلتے ہیں کہ دیکھنے والا خیال کرے کہ کوئی بھاری چیز ان کے پاؤں سے بندھی ہوئی ہے اور وہ تیز تیز قدم اٹھانے سے معذور ہیں یا پھر وہ اس درجہ شان کے ساتھ قدم اٹھاتے ہیں جس کے ڈانڈے رعونت سے مل جاتے ہیں۔

اگر یہ ذہنی کیفیت خود طلبہ کے حق میں نقصان رسا نہ ہوتی تو اُسے غیر اہم اور ناقابلِ توجہ سمجھ کر نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔ لیکن یہ چیز اتنی معمولی نہیں ہے جتنی کہ پہلی نظر میں دکھائی دیتی ہے۔

آخر یہ اندازِ خرام کیوں اختیار کیا جاتا ہے؟ — اگر میں نے اُن کی ذہنی کیفیات کو بڑھنے میں غلطی نہیں کی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ انھیں اس بات کا گھمنڈ ہوتا ہے کہ وہ انٹرمیڈیٹ جو نیر اور سینئر کی بڑی بڑی جماعتوں کے طالب علم ہیں۔

یہ دُنیا بھی کتنی عجوبہ کار ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے اپنے اہلِ ملک کو اظہارِ علمیت کا اس سے کیمبرِ عکس طریقہ سکھایا جاتا تھا۔ وہ جتنے زیادہ عالم فاضل ہوتے اُتنے ہی زیادہ منکسر ہوتے۔ یہاں تک کہ ہمارے ملا اور بندت اپنی چال میں بھی خاکساری اور فروتنی کا اظہار کرتے وہ اس قدر اُگے کو جھک کر چلتے کہ تقریباً دوہرے ہو جاتے۔ اب علم و فضل کا مرکزِ نقل اس کے بالکل مختلف سمت میں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسمانی دُنیا کے قوانین میں ایک عجیب کا یا پلٹ ہو گئی ہے جس نے لوگوں کو سیدھا اور تناہوا بنادیا ہے۔ اگر اتنے ہی پُرس ہوتا تو خوب تھا لیکن بد قسمتی سے ہمارے طلبہ اُس کی دوسری انتہا پر پہنچ گئے ہیں وہ جھک کر نہیں چلتے اور نہ سیدھے تن کر بلکہ وہ زمین کے ساتھ زاویہ مفرجہ بناتے

ہوئے چلتے ہیں۔ اگر اس طریقہ کو ٹھیک مان لیا جائے اور کالج کے طلبہ کو اس اندازِ حرام میں حق بجانب ٹھہرایا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اُن کے پروفیسروں کو۔ جو یقیناً اُن سے زیادہ جانتے ہیں۔ زمین کے ساتھ اُن سے زیادہ بڑا زاویہ منفرج بناتے ہوئے چلنا چاہئے۔

غرض یہ طریقہ نامعقول ہے اور محض نتیجہ ہے لاعلمی اور ناقص تعلیم و تربیت کا۔

میں کہتا ہوں کہ آپ افراط و تفریط سے بچئے اور بالکل سیدھے ہو کر چلئے۔ اس لئے کہ بجز ہندوستان جیسے ملک میں اس طرح چلنے کی ضرورت ہے جس سے صحت مندی کے آثار ظاہر ہوتے ہوں۔ لیکن خدا کیلئے ٹٹوں کی طرح اپنی نت نئی چالوں سے آپ اپنا مضحکہ نہ اُڑائیے ورنہ ہر تندرست دل و دماغ کا انسان اور ہر شائستہ آدمی نہیں ناقابلِ برداشت سمجھنے لگے گا۔ غالباً اسکاٹ لینڈ کے شاعر بسن نے ایسے ہی لوگوں سے پالا پڑنے پر خدا سے یہ دعا مانگی تھی کہ ”جس طرح دوسروں کی نظریں ہمیں دیکھ سکتی ہیں کاش ہم خود بھی اپنے آپ کو دیکھ سکیں“

علم کی دیوی کو خوش کرنا آسان کام نہیں۔ جو لوگ منکسر مزاجی کے ساتھ اُس کے مندر میں جاتے ہیں وہی کچھ باتے بھی ہیں دوسروں کے لئے اُس کا دروازہ بند رہتا ہے۔

علم کی دُنیا اس قدر وسیع ہے کہ جو لوگ جانتے ہیں وہ بھی جانتے ہیں کہ وہ بہت کم جانتے ہیں۔ نیوٹن کا یہ کہنا ایک بے لاگ صداقت کا اظہار ہے کہ وہ علم کے بحرِ ذخار کے کنارے بیٹھا سپایاں جمع کر رہا ہے اور جو کچھ وہ جانتا ہے وہ جتنا کہ اس دُنیا میں جانتا چاہئے اُس کے دس لاکھ حصوں میں سے صرف ایک حصہ کے مساوی ہے۔

میں نے ابھی کہا تھا کہ آپ کو منکسر مزاجی کے ساتھ دو یا مندر میں داخل ہونا چاہئے۔ مندر کے لفظ کو پیش نظر رکھئے۔ ہر کول یا کالجِ علم کے مندر ہیں اگر وہاں کوئی ایسا کام کیا جائے جو ایسے مقدس مقام کے وقار و احترام کے منافی ہو یا اُس کو کم گشتا نیوالا ہو تو وہ ارتکابِ جرم کے مترادف ہوگا۔ مندر میں جھگڑا نہیں کیا جاتا ہے۔ اُس کی ہیئت کو بگاڑ کر اُسے بھونڈا نہیں بنایا جاتا ہے اُسے صاف شفاف اور بے داغ رکھنے اور خوبصورت بنانے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اس مندر میں اگر ایسے طالب علم بھی ہوں جو اُس کی دیواروں کو خراب کرتے ہوں اور جو کچھ اُس کے اندر ہے اُسے بد سلیقگی کے ساتھ برستے ہوں یا ایسا کرتے ہوں کہ کبھی زور میں آکر کوئی بیخ یا کرسی توڑ دی، کسی پھول کو فوج لیا یا کسی پودے کو اکھاڑ پھینکا تو یہ سب افعال ایک مقدس مقام پر نہ صرف یہ کہ ارتکابِ جرم کے مترادف ہیں بلکہ اُن سب کے احساسات کو بھی ٹھیس پہنچانا ہے جو اُس سے وابستہ ہیں چاہے وہ معلم ہوں یا متعلم۔ اگر اس جانب مناسب طور پر طلبہ کی توجہ منقطع کرائی جائے تو مجھے یقین ہے کہ اُن کا ذوقِ سلیم اس نقطہ نظر کو سراہے گا اور اُن میں کے ہونا زدی فہم صحتمند دل و دماغ رکھنے والے افراد کسی ایسی بات کو گوارا نہ کریں گے جو معبودِ علم کے آداب و احترام کے خلاف ہو۔

حال میں کسی شر پر لڑکے نے دو جہانوں میں دو کرسیوں کی بیت کاٹ ڈالی۔ اگر اس ادارہ کے طلبہ کا مذاق صحیح ہوتا تو ایسا واقعہ پیش نہ آتا۔ یہ واقعہ ایک معتمد رائے عائمہ کے نقد ان کا ثبوت ہے۔ یعنی مجرمانہ ذہنیت کے کچھ لڑکے ابھی یہاں موجود ہیں۔

یہ آپ کا ادارہ ہے۔ آپ کی تعلیم گاہ ہے، آپ کا دیا مندر ہے اپنی ہی املاک کو برباد کرنے ہوئے بھی کسی کو سنا ہے؟ میں تو یہ کہوں گا کہ اس قسم کا فعل ایک سخت قسم کی بے ادبی کے مترادف ہے۔

یہ بات توصاف ظاہر تھی کہ امانت خاؤں کے لڑکوں میں سے کسی نے اس فعل کا ارتکاب کیا۔ ان سے کہا گیا کہ جو قصور وار ہو وہ اپنا نام بتادے۔ اعتراف قصور کے بعد اُسے معاف کر دیا جائیگا۔

اگر وہ لڑکا جو اس فعل کا مرتکب ہوا ہے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتا تو میں ضرور اُسے معاف کر دیتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ایک تجویز یہ بھی تھی کہ کوئی اور صاحب اُس لڑکے کا نام بتا دیں جن سے یہ فعل سرزد ہوا لیکن یہ تجویز بھی مجرم کے نام کا بہتہ چلانے میں کامیاب نہ ہوئی اور مجھے خوشی ہے کہ اس طریقہ سے مجرم کے نام کا پتہ نہ چل سکا۔

جس قدر نفرت کی نظر سے میں نے اُس فعل کو دیکھا تھا اُس سے زیادہ نفرت و حقارت سے اُس لڑکے کو دیکھتا ہوں اپنے ساتھی کا نام ظاہر کر دیتا۔

گرسیوں کے بیت کے نقصان کی تلافی سب سے جربانہ وصول کر کے یا پھر اس طرح ہو سکتی ہے کہ آپ کی غلطیوں کی سزا میں جھگڑتوں اور اپنی حیب سے اُس کی قیمت بھروں لیکن یہ بات مجھے پسند نہیں کہ طلبہ چغل خوری کی عادت سیکھیں۔ جس وقت آپ پابندی اوقات اور اپنے کام میں باقاعدگی کی صفات سے متصف ہو جائیں گے، جب آپ کے طرز عمل میں انکسار پیدا ہو جائیگا اور معبدِ علم میں دوسروں کا لحاظ اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا سیکھ جائیں گے تب اس قسم کی انجمنیں جیسی کہ آپ کی ہے کچھ اور بھی سکھائیں گی جو صحیح معنوں میں آپ کے لئے مفید ہوگا۔

یہاں آپ اپنے خیالات کو مرتب و مہذب بنائے اور انہیں قوت و تاثیر کے ساتھ ادا کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں آپ اس میدان میں مقابلہ کی ایک فحتمند اسپرٹ کے ساتھ دوسروں پر سبقت لیجانے کی کوشش کیجئے کہ دوسروں کے خیالات کو بھی آپ برداشت اور گوارا کر سکیں۔ انسان کی فطرت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ کوئی دو انسان کسی ایک چیز پر متحد انجیاں نہیں پائے جاتے۔ ہر معاشرتی معاملہ میں اختلاف آرا پیدا ہوتا ہے۔

اگر خیالات کا اختلاف باہمی شکر رنجی اور کپٹ کا باعث بن جائے تو پھر سمجھنا چاہئے کہ دماغوں میں کچھ فزور ہے۔ اگر ہم صرف اس بات پر ایک دوسرے کا سر بھڑٹے پر آمادہ ہو جائیں کہ کوئی خاص چیز ہم میں سے ہر ایک کو ایک ہی طرح سے نظر نہیں آتی تو ایک مہذب و شائستہ زندگی بسر کرنا ناممکنات میں سے ہو جائے گا۔

میں آپ کی انجمن اتحاد کے پہلے جلسہ کا افتتاح اس امید کے ساتھ کرتا ہوں کہ آپ یہاں فکر و تفکر کے ساتھ اپنے خیالات کو مہذب و مرتب بنانا سیکھیں گے تاکہ انہیں مؤثر طور پر ادا کر سکیں اور اس طرح اپنے مباحث کو مسابقت کی فہمند اسپرٹ کے ساتھ انجام دیں گے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے اندر تحمل اور بردباری پیدا کریں گے۔ خدا کرے کہ دوران سال میں آپ کو پوری کامیابی حاصل ہو۔

”احمد حسین خاں“

“ ”

کلیہ کی خبریں

امرداد ۴۹ھ کے آخری ہفتہ میں کالج کھلا۔ چل پہل اور گھاگھی کا وہی پچھلا حال تھا۔ رخصت اور شرکت کے وہی مناظر آنکھوں کے سامنے تھے۔ نئے آنے والے برادرانِ کلیہ کا ہم خیر مقدم کرتے اور جانے والوں کے ساتھ اپنی بہترین توقعات وابستہ کرتے ہیں۔

نتائج | نتائج اس سال گویا شاندار نہ رہے لیکن پھر بھی کالج نے اپنی روایات کو برقرار رکھا۔ مسٹر کے ستیانارائن امتحان انٹر میڈیٹ میں ریاضیات میں اول رہے۔ مسٹر آر۔ رام کرشن ریڈی نے اختیاری مضمون تنگی میں جامعہ بھرمی دوم آنے کا اعزاز حاصل کیا۔ امتحان عثمانیہ ٹیئر میں مسٹر این۔ سندر مورتی اور بی لکشمی درجہ اول میں کامیاب ہوئے۔ ہم ان سب برادرانِ کلیہ کو ان کے اعزازات پر مبارکباد دیتے ہیں۔

صدر صاحب کلیہ کی روانگی | اگر مائی چھٹیوں ہی میں مولوی حفیظ اللہ صاحب صدر کلیہ کے تبادلہ کی تشریف لے گئے۔ اپنے سہ سالہ دور میں کالج کی ہر جہتی فلاح و بہبود کے لئے موصوف نے اپنی ساری کوششیں صرف فرمائیں۔ آپ ہی کی توجہ سے طلباء کے تقریبی کلب کا قیام عمل میں آیا اور کالج کے احاطہ میں دیدہ زیب طریقہ پرچمن بندی شروع کی گئی۔ طلباء پر آپ کی شفقت اور مہربانیاں ہمیں بھلائے نہ بھولیں گی۔ روانگی کے آخر زمانہ میں وداعی جلسوں کا ایک طومار بندھا ہوا تھا جس میں بزمِ اتحاد طلبہ اور انجمنِ اساتذہ کے جلسے قابلِ ذکر ہیں۔ ان جلسوں میں گلوہوشی اور تقریروں کے علاوہ عہدہ اور عکس کشی کا بھی انتظام تھا۔

بزمِ اتحاد طلبہ | اس مرتبہ بزم کے انتخابات دیر سے ہوئے۔ ”ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا“ صدر صاحب کلیہ کے تبادلہ۔ جدید قواعد و ضوابط کی ترتیب کے مرحلے پیش نہ ہوتے تو یہ کام کبھی کا ہو چکتا

نئے عمدہ داران کا مینہ کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

نائب صدر	متقدم سال دوم	سید شاہ بلخ الدین حسین
مستند	" "	حسین علی
رکن	" "	رام ریڈی
"	سال اول	احمد حسین
"	" "	کشن راؤ
"	دہم	احمد اللہ فاروقی
"	" "	محمد افضل
"	" "	لکشی ترسیا
"	سکھ فارم	رام کرشنا

انتخاب کے بعد ہی جدید کابینہ نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ۲۴ مارچ ۱۹۴۹ء کو بزم کا افتتاحی جلسہ منعقد ہوا۔ محترم صدر صاحب کنبہ نے افتتاحی تقریر فرمائی جس کا اقتباس اردو اور انگریزی دونوں میں دیا جا رہا ہے۔ افتتاحیہ کے بعد نائب صدر بزم کی صدارت میں مباحثہ شروع ہوا، "قومیت کا تخیل انسانیت کیلئے مہلک ہے" عنوان تجویز کیا گیا تھا ڈھائی تین گھنٹے کی گرامر بحث کے بعد طلباء کالج ہوٹل گئے جہاں انہیں بزم کی جانب سے عصرانہ پر مدعو کیا گیا تھا۔ اس میں کالج ہال میں پہلی مرتبہ معاشرتی جلسہ *Social gathering* کا انتظام کیا گیا جو نہایت کامیاب رہا۔

۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو بزم کا دوسرا مباحثہ "آمریت ہندوستان کی مشکلات کا واحد حل ہے" پر ہوا۔ آرا شمار کیے گئے اور ان کی رائے ناکام رہی۔

۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو مسٹر پی۔ وی۔ آر سباسٹین ریڈ رادیات انگریزی نے موجودہ جنگ پراک دلچسپ تقریر کی پرنسپل صاحب نے جلسہ کی صدارت فرمائی۔ محترم مقرر کی تقریر کا اقتباس انگریزی کے حصہ میں پیش کیا گیا ہے۔

بزم کا آئندہ جلسہ *Parliamentary Debate* کی صورت میں ہوگا۔

"Military training should be made compulsory for Indian Universities."

عنوان مقرر کیا گیا ہے

مولوی احمد حسین خاں صاحب کی تشرف آوری کے بعد سے کھیل کے میدانوں کی رونق میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے روزانہ شام کو اساتذہ صاحبین کی نگرانی میں پابندی سے کھیل ہوتے رہتے ہیں۔ مختلف ٹیموں میں لڑکوں

کی تقسیم اور ہر ٹکڑی کے میدان اور اوقات مقرر کرنے سے کھیل میں بڑی سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ اس سال والی بال کھیتیں اور ٹینس کے ایک کورٹ کا اضافہ عمل میں آیا ہے۔ مختلف مقابلے (Matches) ہر مہینہ کو دلچسپی کا سامان بننے رہتے ہیں اور ریلیف فٹ بال ٹورنمنٹ میں گویہاری ٹیم ”دل ناؤال“ نہ تھی لیکن پھر بھی شکست و فتح نصیبوں سے وکے اسے ”میر“ گناہی پڑا۔ اور پھر ہمیں اپنے برادران سابق کی لاج بھی رکھنی تھی۔ بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ ہم ان کی خوشنودی کا اتنا سامان بھی نہ بنتے۔

یادش بخیر ایک زمانہ کے بعد عمدہ داران مقامی سے ہمارا کرکٹ کا مقابلہ پڑ گیا۔ کھیل رہا تو دونوں طرف کا دلچسپ لیکن نتیجہ بیان کرنے سے فائدہ کیا جبکہ ہمیں ناکامی کا ٹھنڈا کھینا پڑا۔ موجودہ کپتان مسٹر سردار اور معتمد مسٹر رنگیا ناٹو بی۔ اے کھیل کا معیار بلند کرنے کی انتھک کوشش کر رہے ہیں۔ آئندہ کبھی اگر ان ”والدین“ سے ہمارا مقابلہ ہو جائے تو انشاء اللہ ہم یہ کہنے کے قابل ہوں گے کہ ”میدان اب کے ہاتھ سے جلنے نہ پائے گا۔“

انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں میں اردو فارسی کا انتظام | بہت دنوں سے طلبائے حال اور سابق کی جانب سے یہ کوشش ہو رہی تھی کہ ہمارے کالج میں انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں کے اختیاری مضامین میں اردو۔ فارسی کا اضافہ کیا جائے۔ صدر صاحبان کلب بھی وقتاً فوقتاً اس طرف توجہ دلاتے رہے تھے۔ بارے خدا خدا کر کے اس سال یونیورسٹی کونسل نے اس کی منظوری صادر کی اور جناب اختر حسین صاحب ام۔ اے (عثمانیہ) کا تقرر اس جاب ادا پر کیا۔ موصوف ایک ادیب اور نقاد کی حیثیت سے مادرِ جامعہ کے ممتاز طالب علم رہ چکے ہیں۔ ہمیں آپ کی ذات سے امید ہے کہ یہاں اردو کے معیار کے بلند کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف کریں گے۔

تقرر و تبدل | اسی سلسلہ میں تقرر و تبدل کا ذکر آجانا مناسب ہے۔ اس سال مولوی عبدالرحمن خان صاحب مولوی ظہیر احمد خاں صاحب۔ مولوی قمر الدین صاحب۔ مولوی عبداللطیف صاحب۔ اور مسٹر رادھا کشن راؤ کے تبادلے عمل میں آئے۔ مسٹر نرسنگ راؤ وظیفہ پر علیحدہ ہوئے۔ ہمیں اپنے ان اساتذہ صاحبین کے تشریف لیجانے کا بڑا رنج ہے۔

ہم مولوی صالح خاں صاحب۔ عبدالسلام صاحب۔ رشید الحسن صاحب۔ نور الحسن صاحب۔ شیخ احمد صاحب۔ صاحبین صاحب۔ اختر حسین صاحب۔ ضمیر عباس صاحب اور مسٹر رنگیا ناٹو کا خیر مقدم کرتے اور توقع کرتے ہیں کہ وہ ہر طرح ہمارا برادری کو فائدہ پہنچاتے رہیں گے۔

مسٹر بیجا۔ ام۔ ایس سی (عثمانیہ) کا تقرر جامعہ عثمانیہ کے شعبہ کیمیا میں جو نیر لکچراری پر عمل میں آیا ہے۔ ہم موصوف

کی ترقی پر اپنی جانب سے پُر خلوص مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

صدر کلیم لائے ہیں۔ آپ ایک زمانہ تک یہاں صدر مہتمم تعلیمات کی حیثیت سے کار گزار رہ چکے ہیں۔ ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے موصوف کی کافی شہرت ہے۔ آپ کا علمی ذوق شوق اور تدبیر کلیہ کی ترقی کی ضمانت ہے۔ آپ کی تشریف آوری کے بعد سے جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ اس بات کا ثبوت دیتی ہیں کہ ہم آپ کی ذات میں وہ سب کچھ پالیں گے جس کی ہم توقع ہے۔

کتب خانہ کالج کے کتب خانہ کی حالت نہایت خراب تھی۔ بہت سی کتابیں تلف ہو چکی تھیں اور جو کتابیں تھیں ان کی حالت نہایت ردی تھی۔ اب کتب خانہ کی تنظیم جدید ہو گئی ہے اور ایک کتب خانہ دار صاحب کا جڈ تقرر کیا گیا ہے جس سے کتابوں کے حصول میں بڑی سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ محترم صدر کلیم کی کتب خانہ پر نظر خاص ہے بہترین ادبی اور علمی کتابوں کا اضافہ عمل میں آ رہا ہے۔

کالج ہوٹل ہوٹل کے انتظامات اب نہایت اچھے۔ خور و نوش کا انتظام طلباء نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے اس وقت ہوٹل میں قریباً ۲۵ ہندو مسلم طلباء ہیں۔ یہاں کے دارالمطالعین مختلف اور دو انگریزی اخبارات اور رسائل آتے ہیں۔ مودب مولوی عزیز الدین صاحب بی۔ اے مقیمین کی سہولتوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔

آنیوالی دلچسپیاں اس سال صوبہ ٹورنمنٹ کے انتظامات کالج کے سپرد ہیں۔ کل حیدر آباد اساتذہ کالفرنس بھی آپس میں ہوگی۔ کالج ڈے بھی منایا جائیگا۔ دلچسپیوں اور مصروفیتوں کے دن قریب آرہے ہیں۔ اس سلسلے میں ابھی سے اردو انگریزی ڈراموں کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ انگریزی ڈرامہ قربانی مصنفہ ڈاکٹر شیکور کی تمثیلی مشقیں ہو رہی ہیں۔ مسٹر ساشین ادا آموزی کے فرائض انجام دے رہے ہیں ان دلچسپیوں کا تفصیلی خاکہ انشائرم آئندہ اشاعت میں پیش کرنے کے قابل ہونگے

بلینچ

think of saving himself and then if possible to save others. I was not, I confess, far different from others in this. Therefore I climbed a tree which was so high that it was beyond the reach of a wild beast. I awaited the wild beast. I saw two bulb-like eyes in the trees. I switched on my torch and found that my guess was correct. In hunger it roared and the whole jungle reverberated with the noise. I guess the small creatures were frightened and hid themselves in their dwellings. I too was greatly afraid.

Gathering courage I aimed at it—in hunger every one whether an animal or a man, eats what it or he gets—so this wild beast had pounced upon my horse. It was tearing the horse to pieces. My shot went wide and the consequence was that the tiger leaped towards me in all its fury. I sent another bullet which went straight into the mouth of the beast. Finding it disabled I discharged two more bullets. It fell flat on the ground. I got down from the tree and to assure myself that the animal was dead I struck it with the butt end of the musket. I walked towards my horse. Finding it in a horrible condition I felt sorry for my faithful animal.

I waited for the break of day. I was in an exultant mood—happy hours pass away quickly—it was the case with me that night, for remember, I had shot my first tiger that night, I do not know when I slept. The birds were singing in the morning. The sun through the morning mist spread itself upon the fresh world. Early in the morning farmers, driving their bullocks and carrying ploughs on their shoulders, were going to their fields. One of them finding me sleeping for such a long time and the wild beast at some distance thought that I was wounded by the beast and the beast was killed. He came near and finding me breathing, knew that I was alive. He woke me. I was astonished at finding myself sleeping for such a long time. Thanking the farmer I returned home. I told my friends what had befallen me the previous night. At noon with other friends I went to the spot. The animal lay flat on the ground and I stood in front of it. One of my friends took a picture. We brought it home. All my friends and relations rejoiced at my success. The skin was tanned and kept in my home as a memorial of my first successful hunt.

This was my dream the night after I heard that H. H. The prince of Berar had shot a huge man-eater in the Pakal forest. Morning found me no more elated & heroic but just a prosaic student of the Osmania Intermediate College gathering my books to attend the interminable lectures.

endless happiness. These beautiful scenes lead a poet into the world of imagination and the regions of the spirit and then he pours out loveliest poetry, that stirs the depth of our hearts, teaches a moral and fashions and creates spiritual beauty.

The Majority of the population in the country consists of farmers and peasants. They are the models of simple and happy life. A peasant rises up early in the morning, goes to his fields, enjoys the fresh air, smells the fresh-blown flowers, hears the melodious sounds of the singing birds, works hard all day long and returns home in the evening where sincere looks and smiling faces welcome him. With malice towards none, with charity for all, with firmness as God gave him to see the right, he works and lives. His purity of purpose, his simplicity, his " virgin heart in work and will " and above all his sweet humanity are more appealing to us than the selfish lives of the town people, who have an insatiable thirst for material gain and the vain pomp of crowds.

Sahibzada Mir Musood Ali Khan,
Senior Inter.

Tiger, Tiger, Burning Bright

On a moonlit night when the stars sparkled like so many diamonds and all was calm and the dwellers of the earth lay peacefully sound asleep in their homes, with my gun hanging across my shoulders and a torch attached to it. I rode away at full speed. On either side of the road were nice green fields whistling in the breeze. The road looked like a strip of ribbon amidst the fields. I had scarcely travelled half the distance, and intended to go that night, when I heard some peculiar noises. I was not sure from which direction they came. I pulled the reins and the horses stopped, I did not hear anything when I stopped. When I started my horse the noises were again heard.

I paid little heed to them and resumed my journey. After some time the road took its course into a forest. The trees were thick on either side of the road and the leaves lay upon one another. The moon light could not pierce them and the road looked faded and brown. I was tired of riding. I dismounted and tied my horse to a tree.

I had hardly taken a seat under a tree than I heard a wild noise. I guessed that it was a tiger. Whatever noise that might be, to be on the safe side I loaded my gun. When a man is in danger it is a human instinct, first of all to

Town and Country.

Cowper's saying 'God made the country and man made the town,' brings out pointedly the difference between town and country. In the country we find ourselves in the bosom of nature and in the midst of her bounties, while in the town we are surrounded by artificial things made by man and have no contact with nature. That is why the poets and the artists have forsaken towns and spent the major part of their lives in the country. They find a perennial source of inspiration in the field, in the forest and in the single idyllic life of the shepherds and peasants rather than in the town.

Peace and quiet are not to be found in a town. From early morning till late at night you have an unceasing tumult and hubub. The din of the traffic, the busy hum of the people going about their business, and the shouts of the street-hawkers disturb life. Men are often disgusted with this busy world of towns where peace is only a name and no where to be found ! But in the country there is peace within and peace without. Therefore the poets express a passionate desire for the peace of rural solitude. Yeats wishes to go to "The Lake Isle of Innisfree," for he says, 'And I shall have some peace there, for peace comes dropping slow.' Alexander Pope reveals his passionate desire for peace and solitude when he says.

"Blest who can unconcernedly find

Hours, days, and years slide-soft away,

In health of body, peace of mind, Quiet by day."

The people of the town are madly materialistic and they are out of tune with nature, a gift given to all by God. Wordsworth in his sonnet 'The world is too much with us,' mourns that most people of the town have lost the power of appreciating the beauty of nature and hanker after worldly gains. He says "We have given our hearts for a sordid boon." The people of the town spend even their leisure time in crowded theatres, ballrooms and at banquets. In this way most of them sacrifice their health, wealth, and happiness at the altar of what they call good society.

How different is the country ! It is the handiwork of nature and she has lavished her bounties upon it. The green fields stretching out on all sides, flowers in full bloom, birds singing on the trees and other beautiful aspects of nature bring us the message 'A thing of beauty is a joy for ever,' and this joy opens vistas to

Perhaps I am wrong in calling this a theft and not recognising in it a piece of socialism. I call them thieves, but, when I say this, I do not mean that they are thieves liable to be punished by law. It is a crime against my feelings but not a blot upon their character

I have had to change my bike more than once and to get a new one for one thing, a fresh bike earns many new friends. My bike serves every one. Men who do not know to cycle use mine to perfect themselves in the art, paying no heed whatsoever to its proper care. They run it against some thing or other which disfigures it permanently. It is not for these reasons only that I have to change my bike for I am fastidious in the matter of cycles and like to possess an attractive, pretty, new and glittering bike.

Once in my life I locked my cycle. But Alas! when next I came to it I found the tyres cut into pieces, the bell missing, the glass of the light shattered, the carrier screws removed and on the seat as I learnt too late was a slip of paper with "fool" on one side and gum on the other which was the exposed side. Some body had been very vindictive. I unknowingly mounted the bike (It was a dark night) and discovered the whole mischief the next moment and dismounted and walked on — By the way, it took me two full days to discover that some thing had stuck to my trousers. When I found every body grinning I thought a wave of cheerfulness was passing over the world! For this reason I do not dare to lock my cycle any more.

I some times wonder what pleasure it is that, I derive owning a cycle. Children, youth, boys, girls, old men, in fact one and all take pleasure in cycling. But I am the only man who takes equal pleasure in pushing one about for their service. I invariably find my cycle damaged and spoilt and I must go back home on foot. In the beginning it was a burden past enduring. The useless toil and foolish figure I cut enraged me. But time has palliated the severity of this unkindness. Now, I am reconciled to it and derive habitual satisfaction in trundling the cycle for others use. I cannot help it. I know, I am not using my property as I might. Time is a great healer and I am resigned to my lot on earth. You can see me every now and then of an evening pushing my cycle home and you will not find me cross, though perspiring.

My Cycle and I

Every time I visit Sharat, a very close friend of mine, I find, on coming out of his chamber that my bicycle is missing. But what can be done? Some gentleman carries it off — of course for a season long or short. If he brings it back within a few hours I should consider myself lucky. When he does not, what should I do? Hire another? Alas! my pocket money is little and I would like to spend it in a coffee hotel. Should I walk home or wait for him?..... In this I am always optimistic, and so wait till the cycle is brought to me again.

I re-enter Sharat's chamber and bid him a fresh good morning. I experience some awkwardness in meeting him again, just after I have bid him good bye. But he is not ruffled in the least and, though he is well aware how I have been incommoded, asks me "your cycle?" It makes me very angry. To add fuel to the fire he laughs aloud and I am the more enraged. My pent up feelings find relief in a little explosion. "Let the ruffian come. I will thrash him — kill him — take my bike without my permission? What does he mean!"

Either Sharat's brother, or his wife's or a totally new fellow has walked off with my cycle or rather cycled off with it. He returns but I cannot touch him; nor can even scold him. I will only take back my cycle and march homeward.

It happens that the young fellow, who steals my bike starts along any road (a slope is preferable). He reaches it's end; turns either to right or left as the spirit moves and goes along the second road till he reaches its end. In this way he will go along the third road — fourth — fifth and so on till he at last comes to the same (the first road) from which he started on his gyrations. My cycle passes through some cycles before it returns to me. What pleasure he derives remains unknown to me and why he steals is a mystery to me. As soon as he enters the chamber, I go out.

Most of my friends, I am afraid, though at odd moments I consider myself very popular, care more for my cycle than for me. It attracts their first interest. One of them takes my cycle to go to a house not more than a hundred yards away. Then, a friend of his takes it perhaps to go the next hundred yards and so on the bike goes on from hand to hand and the last master of it cannot recognise me—the first and original master. I must wait till the first man returns and gives it back to me. (Here is another cycle performed). Meanwhile I am in great anxiety over my lost bike. I can neither eat nor drink nor sleep.

that there should not be traffic disturbance. I with my friends stood on the road to see him while he returned. But after a long wait, we were disappointed to know that his car had already passed.

On the 19th, in the morning, we were standing in our college compound. The prince was going to shikar. The princess was driving the car. At first we could not recognize them for they were in shikar dress. We were fortunate to see them clearly for the car was halted for a few seconds in front of our college. I am sure their Highnesses have pardoned us for our youthful exuberance on that occasion.

Her Highness, I heard, visited the two important Girls' schools in the town. For a week buntings floated gaily over the road in front and I am sure a grand welcome awaited Her Highness. One day the princess entered our High school compound and returned after enquiring for some direction. Perhaps the beautiful garden of our institution attracted Her Highness.

The day before yesterday, while I was returning from school, I saw a dead tiger being carried on a motor car. The police men were shouting, "The prince has killed the cruel tiger". I asked one of them what it was. He answered that, that huge and cunning tiger, which had killed seven persons till then, had at last been killed by the prince and princess in Pakal forest.

The Prince and Princess went often to Mulag forest in order to shoot tigers. Daily I used to see the police standing on both sides of the road controlling the traffic and waiting for the Prince to pass. They must have had sturdy legs.

To-day that is on the day of his departure, he went by the Karim Nagar road to shoot snipe.

On the 24th, the Princess left this place.

All the local officers, wearing dustars awaited His Highness at Kazipet station in order to give him a warm send off. It was said that he was going to Aligarh to receive the LL. D degree of the university.

Thanks to their Highnesses our Warangal was animated and lively for over a week. Long live their Highnesses the Prince and Princess of Berar!

way. The petromax lights were lit, where there was no electricity installation. There were a large number of police men lining up the roads from the Royal residence to the water works.

At last we reached there at 4 p. m. The water works was encircled with cars. The building was beautifully decorated with electric bulbs. The people, who had passes were rushing in, where the prince was to deliver his speech. Some of them who entered the hall, I suspect had no passes but fortunately they had come there in motor cars. Unfortunately, we had gone there on foot so we could not enter and we envied them

It was said that the Prince would come there at 4-45 P. M. I thought as he was a prince, as there was none to question him when ever he came, so he would come at what ever time he liked. But on the contrary, our prince was there exactly at 4-45 P. M. He was welcomed with cheers, which he graciously acknowledged. Even though we were out of the compound, we saw the Prince and Princess clearly as they were seated on the specially erected dais.

Then, some gentlemen, on behalf of the local municipality read the welcome address and requested the prince to inaugurate the water works.

The Prince delivered his speech in clear tones, which reached even us who were without. His every word was applauded. We could hear his speech clearly for the local authorities were kind enough to arrange loud speakers.

Then the prince opened the water works by throwing open a whole stream of fountains. Several photos were taken on that occasion. Then we saw tea being served and returned home.

Next evening, when the prince went to open the Mukarram Jahi Road in Warangal, thousands were awaiting him. The people were standing on both sides of the high road. The police who were controlling the traffic experienced much difficulty. People were standing near the arches, for they knew that his car would be driven slowly. At last the car passed us. The prince was garlanded at every arch. Some of the arches were beautifully illuminated. We cheered him with great vigour. He and the princess smiled at us. Later in the evening, the whole procession gaily passed us, when the prince returned to his residence.

It is said that the next day, that is, on the 18th, he went to Pakhal forest to shoot. We could not see him on this day, for we heard no whistles as the police men were ordered by the prince not to whistle at the time of his arrival so

The Maharajah's College treated us with much courtesy and were very hospitable.

But the tour was at an end and so with sad and glad hearts we duly entrained for Warangal. And here we are.

Their Highnesses The Prince & The Princess of Berar in Warangal.

There are a number of people, who come to this town on a visit, for it is a place of historical importance. They come and go. But the visit I would write on, was not that kind of visit.

It was rumoured that, His Highness the Prince of Berar, the Heir-apparent and the Princess of Berar, would come here on the 16th Dai to open the Warangal Water Works. The people of this town were so happy as children over the news. It was said that he would pay a visit to our College. The college boys were very happy that they would have a fine opportunity to see their prince.

He is a popular prince. H. E. H's subjects love him with all their hearts. So naturally there were to be grand arrangements.

The local officers were busy decorating the town and especially the Aivan-e shahi building, where they would reside. This building was decorated beautifully with various coloured electric bulbs. The roads were being cleaned day and night. Several arches were being constructed from subedari to Warangal. Some prominent citizens were busy in collecting subscriptions for the construction of these arches. It was a fine sight to look at the bullock-carts, which come in large numbers from several villages loaded with goods. Camps were being erected in front of the Aivan Shahi for the officers who were coming with the prince. All the police men of the district had come here for duty. Our eagerly awaited prince arrived here on 16th instant at 11-30 A. M. driving himself from Hyderabad to Warangal in two hours, after fulfilling his engagements on the way. That takes my breath away! He entered the Aivan Shahi through the gate. I caught a glimpse.

I was very anxious to have a clearer view of the prince. As I was thinking of this, a friend told me that the prince would open the Warangal water works at 4-45 P. M. I, with my comrades, went to the water works on foot about two miles off, for the main road was closed for tongas and cycles. Motor cars were flying past in large number. There were several arches on the

after the visit, went to the nearest cinema halls. Of course no show was on, but we satiated our longings by gazing on the hangings on the wall. We had been ordered by our C-in-C to return as soon as it was dusk. We feared martial law. So we returned to report ourselves at the exact time.

Then we rushed to the carriages and spread out our beds as if it was our reserved compartment and told so to all other passengers who were affected with the same curiosity to visit Mysore as we. But you cannot dupe all the world all the time. One stout person, he was stout in more senses than one, entered the carriage pushing himself sideways. His voice rose high against our denial to his right of entering, the carriage echoed with his and our clamour. We treated him generously, reserved for him a double seat though he had not paid double charge, and we performed a christening ceremony and there after called him "Buffalo Bill." The compartment resounded with the vocal sounds of the above mentioned animal. Thus the journey passed. By morning we were in Mysore. We hired a cart and proudly occupied the upstairs of a house which was very near to the Maharajah's palace.

Now we had enough time to hunt through the streets of the city on hired cycles, now halting in a hotel, now here, now there, visiting the exhibition and passing running criticisms on it all which occupied our high minds for some time. The next place of interest which attracted us was the palace of the Maharajah. Some looked at it with wide open mouths, some without winking, some remarking casually that it would have been better used as a guest house for us.

It was time for the Maharajah to appear on the State Elephant. He saluted us! And we shot him with the camera! By his side was the present Maharajah, then only a prince, and we never dreamt that next time it would be his turn to go through the city seated on that elephant.

The same night we visited Brindavan Gardens reputed to be one of the most beautiful gardens of the World. On seeing the wonderful beauty of it we felt greatly exalted in spirit and its haunting beauty and grandeur visited even our dreams. Some of us visited Cauvery Falls and Tippu's Tomb and nothing remained except to try conclusions with Mysore sportsmen.

We went to the Maharajah's College with all our players and got fixtures in Basket ball, Volley ball, Hockey and finally in Cricket. Among all the games the most spiritedly played was cricket, though it ended fatally for us.

by 3 runs and 2 wickets. Then stumps were drawn. The officers looked hot and tired and appreciated the cool drinks we served them. The bowling honours of the day went to our Captain who captured seven wickets for 29 runs. He maintained an excellent length throughout the game.

[Rang Raj was bat-in-hand with 28 to his credit Ed.]

My Trip to Mysore.

Every one was ready with his baggage on the platform jostling his way about or slapping one on the back, obviously very pleased with himself and the whole world. The train whistled in the distance and soon puffed in. We rushed in wild haste. Some took their stand on the foot board, some peeped out of the carriage, some stood serenely philosophic "revolving many memories" at the door and amidst the cheers of our friends who had come to see us off, our train steamed out of the platform.

We were in Secunderabad within three hours. We tumbled out to examine the city which stood shimmering in the city lights, the din increasing westward farther into the interior. We soon returned. Now the struggle for assleeping place on the platform raged royally. Some who were too lazy to unroll their bedding squatted on others' bedding depriving the innocent but pacifist owner of his recess of necessary comfort. Or somebody would come and snatch the blanket, overturn a bed with a fellow in it. Thus every kind of prank was played by those who did not seem to need any sleep.

Our section of the platform was a veritable bear garden. The carriages were there in the morning ready to move us to Guntakal. We scrambled in with eager visions of strange cities, "New places other minds", some tracing it out from album pictures and some from projections of Warangal. Changing of trains became epidemic for there were no throughs to Bangalore.

At dawn among the thick mists our train puffed slowly through forest and valley but our vision could not penetrate them far as to enjoy the natural beauties but when the first rays of the sun touched the earth we saw the white dew-drops glistening like pearls in the leaves and grass. Then we heard someone shout "Bangalore". Soon we were busy disembarking. Then with bedding on one shoulder and a hand in the trousers pocket (you see we were gentlemen!) went out of the platform. Our stay there was but for a short twelve hours. Within this trifling period we visited the town, principally a coffee hotel, and somewhat heavier

Mr. Nazim Husain was joined by Obeidullah, a veteran player of Nizam College. This pair raised the score to 11 when Mr. R. Naidu brought off a nice catch which dismissed the first named player with 2 runs. Then Mr Hashmatullah partnered Mr. Obeidullah. The score board showed 24 when Mr. R. Naidu with that off break of which I had given earlier notice, dismissed the new comerpresenting him only 6 runs which included two hits to the ropes. Then Dr Mahmudullah, a jolly player stepped in to face Mr R Naidu, underrating the new batsman gave him a slow ball and this his opponent swiped to the bounday. Mr. R. Naidu might have remembered that the batsman is the brother of Mr. Hameedullah, the famous polo player-these things go by families! There after came a change in the bowling. Venkat Narayan, a steady bowler took over the bowling and forced the batsman to give an easy catch to me, which I held. Then Mr. Ahmadullah joined Mr. Obeidullah and was dismissed for 3 runs. Then came the partnership of Mr. Obedullah and Mr. Nasirkhan, a very good batsman. This partnership yielded a number of runs against the splendid bowling of our captain. Half a century was registered on the score board. Two runs later that sticky player, Mr Obeidullah was dismissed by Mr. R. Naidu. His score included two 4's and seven 2's. Afterwards all the officers one by one were dismissed by our bowlers Mr. Nasirkhan had the honour of coming out bat-in-hand with 21 runs to his credit. Thus the officers' total ran up to 72.

As there was not much time for two innings, it had been decided to play only one innings. The officers went into field and our college XI send their best openers, Saranga Pani and Venkateshwar Rao to face Mr. Hashmatullah and Mr. Obeidullah. Venkateshvar Rao had just broken his duck when Mr. Hashmatullah got him dismissed. We expected more from this player but cricket is a glorious game of chances. The score-board showed only 7. When I joined in, I determined to improve the score. We both began confidently but Mr. Obeidullah sent away my partner by bringing off a nice catch. Then my Captain joined me and we both, playing steadily, raised the score to 30 when the umpire declared my Captain L. B. W. Venkat Narayan came to face Mr. Nazim Husain. He too was by chance out for a zero. Then my teacher, Mr. R. Naidu came in and sent his first ball to the boundary. We both together raised the score to 50 when unfortunately Mr. Naidu was stumped when attempting a run. The loss of this valuable wicket was due to me for I gave him a wrong start. The score ran up to 61. Kamlakar came in but was caught by the bowler himself. Our tail did not wag much but Damodar Reddy gave a nice stand to me and I was able with some hits to the boundary to raise the score to 75 and thus we won a victory

The match started at 9-30 a. m. The officers had their batting first and all were out for 71 runs. Our team scored 75 runs for 8 wickets.

Mr. Ahmad Husain Khan, the principal and Mr. Ansari, additional sessions judge, Warangal umpired during the match. We expect to witness more such matches which we believe to be of great benefit to both parties.

A detailed report of the match appears elsewhere.

A Cricket Match between College XI and Officers XI

Our Principal is taking a keen and personal interest in the College games and sports. One result of it was that after a long gap of three years a Cricket match between our College XI and Officers XI which used to be an annual fixture was played on our grounds in ideal cricket weather. The pavilion presented a very lively appearance filled with spectators consisting of officers, members of the college staff and students. The Officers XI comprised some old cricket fans, but all of them were out of form and condition, and some of others appeared to be playing for the first time. It was surprising to find them put up a tough fight. We were confident of sweeping off the Officers XI very soon from the field. Mr. Nasir Khan captained their team and Sardar Ali ours.

Thus ran their list — (1) Mr. Nasir Khan (Captain) (2) Mr. Nazim Husain (3) Mr. Obeidullah, a Veteran, (4) Mr. Hashmatullah, my geography teacher who was borrowed by the officers, (5) Mr. Mahmudullah, (6) Mr. Ahmadullah, (7) Mr. Azeez, (8) Mr. Butt, rather an interesting fielder, (9) Mr. Kamuel, (10) Mr. Vidya Sagar, an old student, whom it is a pleasure to admire and (11) Mr. Mahmood Ali. Some of these were good players. Now our College Cricketeers — (1) Sardar Ali Khan, (Captain), a deadly bowler, (2) Mr. Rangiah Naidu, watch his off breaks, (3) Myself, ("not least, but honoured of them of all" Ed.), (4) Sarangapani, fine opening batsman, (5) Venkateswar Rao, a nice fielder, (6) Venket Narayan, in spite of some handicap a steady batsman, (7) Kamlakar, off hitter, (8) Damoder Reddy, a fine blocker, (9) Aga Reddy, a good bowler, (10) Subramaniam, a fast bowler and (11) Krishna Murthi, a hitter.

In fine courtesy our team put the officers in first, who sent Mr. Azeez and Mr. Nazim Husain to face, Sardar Ali and Mr. R. Naidu. Their opening was disastrous because Mr. Azeez was run out and went away with the score as zero.

Apart from these a troop of about hundred and fifty young boys take hygienic calisthenics with the school band playing on an open field in the evenings.

Students who come from places beyond two miles, like Mathwada, Vaddypalli and Kazipet are not neglected. Their teams have been formed and they are encouraged to organise games in their localities. Games material is given to them from the College and they are playing with greater interest every day in their fields.

For the College classes apart from Hockey, Football, Cricket and Volleyball which they play on the High School fields a Tennis court is maintained. About fourteen students play this game.

Thus side by side with academic progress, there is healthy physical development, under the best possible conditions. We hope to see a healthy growth of true Sportsmanship within our College and look forward to the day when we can proudly point to every player of ours and say "he represents the Osmania Intermediate College, Warangal."

Kazipet War-fund Foot-ball Tournament

Our team reached the finals after defeating the Azamjahi Mills team and the Secunderabad Traffic team in the first and second rounds by four against nil and two against one goals respectively.

The final match was played on the Normal School football field on Friday the 22nd of Aban 49 F., against the Old Boys team. The old boys team contained some ubiquitous veterans like Suci, Maqbool and Juna from Hyderabad. We lost the match by three goals—all was lost but honour! The untiring efforts and zeal of our players against a superior combination was noted by those who admire true Sportsmanship. In passing hats were on where they need not be on, and soles were wanting where they should have been !

At the end of the game individual silver cups were awarded to the winners and silver medals were awarded to the runners up by Mr. Badruddin, Subedar Warangal, who also spoke highly about the game of our players.

Cricket Match

On Friday the 22nd of Aban a cricket match was played between the local officers and the college team.

As regards the incident itself, it was clear that it was done by the hostel boys. They were asked to give the name of the delinquent and were told that if they confessed they would be excused. If the boy had confessed, I could certainly have excused him. No confession was coming forward. It was also suggested that somebody else might point out who had done it. This suggestion also did not elicit the name of the culprit. I am glad it was not revealed. Much as I disliked the act I would have disliked the fellow who pointed out the name of his companion more. The loss of the cane seats could be made good by a collective fine or myself suffering for your sins by paying its cost from my pocket. But I do not want students to learn "tale-bearing."

When you have learnt to be regular and punctual in your work, to be humble in your attitude, considerate and well-behaved towards others in the temple of learning, Unions like yours can teach something more. Here you learn the need to arrange your ideas properly and express them forcibly. You try to excel over others in this field in a spirit of healthy rivalry and above all learn to tolerate what is not your own point of view. Human beings are so constituted that no two of them agree in everything. Differences of opinion arise at every step in social intercourse. If differences of opinion lead to ill-feeling or quarrels, then there is something wrong with the state of mind of the people concerned. Civilized life would be an impossibility if we break one another's heads, because we do not look exactly alike at a particular thing. It is in the hope that you will learn to think, to arrange your ideas properly to express them forcibly, and in doing so carry on your discussions in a spirit of healthy rivalry and above all learn toleration, that I inaugurate this first meeting of your Union and wish you success during the year.

Programme of Physical activities.

According to the Programme for physical instruction drawn up by the Principal, every Student of our College plays some game or other regularly. Students who come from places beyond two miles are exempted from attendance at games in the School. There are thousand students in all who play Football, Cricket, Hockey and Volleyball in the two shifts arranged for every evening. There are about twenty Senior Football teams, twelve senior Hockey teams, twentyfour Volleyball teams, and two Cricket teams, with sixteen football junior and Six Hockey junior teams. There are five football fields, three Hockey fields and half a dozen Volleyball courts with two pitches for Cricket.

Different teams are assigned to different members of the staff, who mark their attendance and give them necessary coaching—for it is realized that unsupervised play is injurious to a student's sound development, physical and moral.

erect. Our scholars do not walk erect, but they try to make an obtuse angle with the ground. If this is proper and College students are justified in walking in this fashion, I suppose their professors, who do know more, should make a greater obtuse angle. This is absurd. It is merely a result of ignorance and bad upbringing and bad education. By all means walk erect. God knows there is need for such healthy mode of walking in a country like India. But for goodness sake do not make fools of yourselves by such acrobatic methods of propulsion. All healthy minded people, all decent people would think you are insufferable. It is only when confronted with such people that the Scottish poet Burns must have cried to God for the gift to see ourselves as others see us. If pride enters your heads at such an early stage, there is an end to any growth of knowledge in you. The goddess of learning is a very difficult lady to please. People who enter her temple with a humble mind alone gather something. For others the gate is bolted and barred. Knowledge is so vast that those who know must know also that they know very little. If Newton said that he was gathering shells on the sea shore of the ocean of knowledge and that what he knew was only a millionth part of what is to be learnt in this world, he was expressing a literal truth.

I just now said that you must enter a "temple of learning" with a humble mind. Mark the word 'temple.' A school or College is a temple. Anything done there to minimize, to lessen, to disfigure, bring discredit to the dignity of such a sacred place is a crime. You do not quarrel in a temple. You do not make it ugly by disfiguring it. You try to keep it spotlessly clean and try to beautify it. If there are students who disfigure its walls, if there are students who treat whatever is inside it, carelessly, or with violence break a bench or a chair, pluck a flower or pull out a shrub, these are committing not only a crime in a holy place but they are hurting the feelings of all those connected with it whether they are students or teachers. If this is brought to the notice of the students in the proper way, I know their good sense would appreciate this point of view and the healthy, the sane, the good amongst them, would not tolerate anything that goes against the spirit of this attitude towards one's temple of learning. Recently one mischievous student cut up the cane in the seat of two chairs in two class rooms. If there had been healthy public opinion in this institution, a thing like that would not have happened. The incident shows that there is no healthy public opinion. There are still a few amongst the boys with a criminal mentality. This is your institution. This is your temple of learning. This is your place of education. It is more to you than your own house. Whoever heard of a boy destroying his own property? I would go a step further. An act like this is a sacrilegious act.

himself to the most advantageous position. It is no concern of his, if others have a better claim for that position. He is not worried if those that are weaker and younger are pushed aside. Go to a big railway station or to a big theatre on a first night and see how people buy tickets. Everybody wants to be the first to get the ticket. People feel uncomfortable and people get crushed, but our friends do not care what happens. They happen to be strong and so they must have anyhow be the first. This is the law of the jungle. The rule of law, of order, of civilized life, is different. You go to the biggest station in England. There are perhaps more people waiting to buy tickets. What do they do? They form a queue. The man or woman or child who comes first will stand first. The one coming next will stand by his side. Thus they would arrange themselves into a queue two abreast. Woe betide the fellow who, owing to strength or position, tries to break this rule. He will probably be mobbed by the people, if he persisted in that attitude. At big matches of football and cricket there is sometimes a crowd of 80,000 people. They go and see witness there in order and disperse in order. No casualty results. You have such big crowds here on important Melas. A few people get crushed. A number of lives are lost.

If we go further up and watch the junior and senior Intermediate class students, we shall notice that the majority of them are quite decent. But in some another kind of disease is noticeable. I do not expect such students to be late, to be talkative and to be inconsiderate. They are past the stage where these things are done. I take it for granted that they have learnt these elementary things. The disease there takes a different form. Some of them walk so slowly that one would think that something heavy is tied to their legs and that they are unable to move quickly. Or they walk with exaggerated dignity - dignity bordering on pride. If such a state of mind was not harmful, to the students themselves, it might be passed over as something unimportant, too petty to be taken any notice of. But unfortunately it is not such a petty matter as it appears at first sight. Why is such gait adopted? It is because, if I am reading their mind correctly, they are proud of the fact that they are in the great Junior and Senior Intermediate classes. This is a funny world. Time was when people in our own country were taught to show that they had more knowledge in a different way. If they were more learned, they were more humble so much so that it was not uncommon to see Mullahs and Pandits showing meekness and humility by the way they walked. They stopped forward - they were almost bent double. Now the weight of learning has an opposite effect. The laws of the physical world seem to have undergone some strange transformation. It makes people

omnibus invitations, what is it that happens at smaller parties? You invite a few friends or relatives to a dinner or a lunch. Time is definitely given. Out of the half a dozen asked, one or two may be late by a few minutes only, but the majority will keep others waiting. All the pleasure of the dinner is lost by their not turning up in time.

Leave this question of punctuality and regularity and turn to other aspects of 'education'. Take "good manners". This is such a comprehensive term and includes so many things that a detailed consideration of it would take up a lot of our time. I shall just refer to certain aspects of it. A well-bred boy or man does not talk in a loud manner. He is considered a nuisance by all if he violates this rule. Some of you, gentlemen, I find, do not seem to be very particular about this. When I first came to this College and was sitting doing work in the Office, I got a few shocks from the neglect of this rule. Every time a bell was given, boys would change classes. When passing in front of my room they would go talking in a very loud manner. At first I wondered what was happening. In fact I asked the peon once or twice to see what was happening. I thought probably some heads were being broken. I was told IV or V Form boys or IX or X classes were just talking in a friendly manner. If you cannot judge the pitch of your own voice and decide how loud you have to talk to become audible to a person with whom you are walking, then there is something wrong with you. You are wasting unnecessary energy, which would be utilized for a better purpose and you are making a nuisance of yourself. You are not showing proper consideration to others. Even if you are foolish enough to think that you are doing no harm to yourself, you have no right to be inconsiderate towards others.

Talking about your going to classes, I am reminded of something else. It is usually the smaller boys that are guilty of talking loudly. Amongst the bigger ones i. e. of the higher classes, the disease takes a different form. Some boys of the 9th and 10th classes think it undignified to walk in a line. They would just fall behind a little or walk two abreast or walk at a more leisurely pace. So long as they reach the class before the teacher, one might ask, what is the harm? The loss is not that they go to the class late. The loss is that such boys have no regard for order. They prefer to do things in a chaotic way. This is not all. It is symptomatic of something else. They have no control over their bodies, their minds, over themselves.

What such disorderly habits lead to, is seen everywhere. Compare and contrast this with the state of affairs in civilized countries. Here in India you go to a theatre or a circus or to a football or cricket match. Everybody is trying to push

by us is not of a very high quality. Take even unskilled labourers. People who have taken the trouble to make comparisons, have learnt with a certain amount of chagrin, that the work turned out by our labourers is not half as much as is turned out by unskilled workers in the advanced countries of the West. What is the reason? There may be other causes, but the most important of these is that, due to bad upbringing, our lives are not properly regulated. We have no fixed time for doing our work, for eating, for sleeping. Instead of putting our heart and soul into the work on hand and devoting all our time to it, we go about dawdling and playing with it. Unskilled work, (being not very important,) may not cause much damage to national interests; but skilled work done in this fashion would place one's country at a great disadvantage in this competitive age. If these things are to go, a beginning is to be made in our educational institutions. If we do not learn here, punctuality, regularity, thorough and honest work, for the life of me, I cannot imagine where you are going to learn them. If I insist on these qualities in you, if you are asked to be punctual, to be regular, to be honest and thorough in your work, it is not to please myself. If you are unpunctual, irregular and slipshod in your work, the solar system is not going to be upset, the heavens are not going to fall. But you will grow up in to men who cannot be depended upon. And so far as this College is concerned, no honest real good work would be possible, if these are considered unimportant and trifling.

How much importance is attached to one of these things viz, punctuality was brought home to me during the last Great War. In 1915 I happened to be in London. For the sake of exercise I used to take long walks. The streets in those days were also kept dark for fear of Zeppelin raids. While returning I got lost in the labyrinth of its streets and was late for dinner by a few minutes. The shock this gave to my land-lady taught me a lesson which I cannot forget. When she saw me, she merely gave a painful look towards me and was silent for the rest of the evening so far as I was concerned. With other members of the home she was the same garrulous lady who never controlled her tongue for a minute. That day I swore that I would never go late to a dinner at an Englishman's house even by a minute. Contrast this with what happens at our houses. In the first place in few houses all have dinner at the same time. Even when formal invitations are sent round, people do not try to be punctual. Leaving aside those omnibus invitations where they invite half the city for a marriage party, when it is left to you to go at any time during certain fixed hours, — (Even here people do not keep time. They may have been asked to go between 8 A. M. and 1 P. M. and yet you find people coming in at 3 and 4 P. M.) — leaving aside these

would assign to India in his scheme of things. Even self interest dictated the strengthening of those forces opposed to Dictator oppression. Under that tyranny we shall miss for ever that road to self government on which India has started, and the paths of peace. We would sink into a slavery worse than death.

Mr. Sebastian exhorted the students as loyal subjects of His Exalted Highness to follow the lead of his statesmanship and by word, deed, and thought fight the forces of reaction and tyranny. He told them that the shadows would lift in God's good time and we would all share the joy of having done our mite to rid the world of its terror, under our Captain, the Faithful Ally of the English.

Inaugural Address of the Principal to the Students Union

Members of the Union :—

I understand that it has been customary for the Principal to address the members of the union at their first meeting. It is unfortunate that the first meeting should have come off so late in the year. It is also a misfortune that here in Warangal we cannot easily get people to give an inaugural address. Speakers there may be, and so far as I know, there are quite a number of them. But an educational institution of the standard of your College needs persons of a particular type viz, people with knowledge, people with some sort of status and position in the academic world. Let us hope in future we shall be able to secure a suitable person every year—a person, who from his vast knowledge of a particular subject, be a source of inspiration to the members of the union. In the meantime we shall carry on as best as we can.

In coming forward to fill this gap I thought that this would be a good opportunity to consider along with you certain aspects of the educational problem. You come here to be educated and not merely to be coached up for some examination. Educating you is not a simple problem. It would have been simpler if your homes could teach you right conduct and build up your character. This is not done at the majority of Indian homes. Even educated persons find it difficult to educate their children at home. So much so if this school neglects this job, there is no place where this defect could be rectified. Perhaps it is because that this side of our education is so much neglected that we have become notorious for certain weaknesses. Whether Hindus, Moslems or Christians, we are considered lazy, unpunctual, irregular and unmethodical; consequently the work turned out

A brief report of the speech is given below :—

Mr. Sebastian exhorted the students to take interest in the facts of the world around them, as was proper for students, for out of them were their judgments moulded. This was one of the principal aims of education. The war was one stupendous fact that overshadowed the world at present, and they could ignore its urgency only at the risk of grave peril. He said he was not making any claim that he had grasped all the complex issues involved in the titanic struggle, the immediate tendencies, and ultimate hopes depending upon it. But he advised them to define for themselves what their attitude should be, for they could not afford to drift, even in thought. He reminded them that from the beginning of the war, in fact long before it, there had been a spate of hatreds, mingled with promises of a new era, and a new heaven and a new earth. Hitler, Mussolini and Matsuoka have been announcing a new world order, which they would establish. He referred to the fact that it was fashionable for nations now to talk of a new world order, whatever that may mean. He asked them to examine the content of this new world order, so far as it had revealed itself. To start with there was that act of brigandage which took Abyssinia from the Negus. Then the senior partner, in turn, seized Czecho-Slovakia, raped Poland, overran Denmark and Norway, conquered Holland, Belgium and France, and imposed her tyranny upon them. Recently Greece had been the victim of an unprovoked act of aggression on the part of Italy. Now it seemed that the aggressor, was doubting the wisdom of what he had done. In the far east, Japan had been raining destruction and murder for years upon a helpless people who have sworn to die rather than yield. These were the beginnings of the New World Order which the Berlin-Rome-Tokio axis announced.

After that murderous aerial attack on the East end of London some two months back a prominent cabinet Minister quoted "our heads are bloody but unbowed". When Mr. Churchill was asked what Britain's War aims were, he replied bluntly but truly that they were fighting for survival. To Britain defeat meant the loss of all those things which it held dear—Liberty, the democratic form of government, its special way of life etc. Not Britain alone, but the whole world would be the poorer for the loss of these precious prizes secured after the struggle and strife of centuries. Nazism and Fascism would take their places. Mr. Sebastian asked the students to compare the flattery which the radios broadcast from Berlin with what was said about Indians to German audiences by Hitler himself. There Hitler considered Indians to be not fit for anything higher than being hewers of wood and drawers of water. There could be no doubt what place Hitler

and offered useful advice to the students. After that there was a debate. The subject for discussion was that "The spirit of nationalism is inimical to universal brotherhood."

The debate opened with a speech in favour of the proposition by Sahebzada Masud-ali Khan, which was opposed by Mohamed Afzal. The debate continued and after an hour's hot discussion, voting took place. There was an overwhelming majority for the proposition. Finally the vice-president addressed the house. He concluded his interesting speech with "much can be said on both sides".

Soon after, all the boys of the Senior Section who had been granted passes before hand, were entertained to tea arranged in the college hostel. Every thing was well arranged. After the party there was a social gathering at 8 p. m. in the college hall. The hall was full of students. A few teachers also favoured us with their presence. Our programme began with orchestral music which was followed by various items which were much enjoyed by the audience. The clock struck eleven when the gathering dispersed. Thus our half a day's activity came to an end. No doubt the good will and co-operation of our friends was the secret of success in our first attempt.

On the 10th of Dai 1350 F. another meeting of the Senior Section of the Students Union was held in the College Hall. The Vice-President presided. The President regretted the paucity of Speakers and hoped that more would shake off their shyness at the next meeting.

The subject for discussion was 'Dictatorship is the only solution for the Indian Problem.' The debate was opened by Gulam Dastagir and opposed by Sahebzada Masudali Khan. It proved to be a fairly good debate and the points of orders that arose in the conduct of it enhanced the interest of it. The resolution was put to the vote and lost. The meeting ended with a stirring speech by the president.

A special meeting of the Senior Section of the Students Union was held on the 13th of Dai 50 F. in the college hall. Our Principal was pleased to preside at the meeting. Most of the members of the staff were also present. Mr. P. V. R. Sebastian, Reader in English, spoke on the "War aims of Britain in the present European War."

sections take part, and read papers of academic interest and give model lessons. Thus once a month a general meeting is held, and once in two months three meetings of the different sections are concurrently held. During this academic year 1349-50 F, till now, two monthly meetings were held in Meher and Aban. At the first meeting Mr. Mohd. Abdul Aziz, M. A., B. T., read a paper on "School Discipline", and in the second meeting, Mr Y. R. Iyengar, M.A., gave a demonstration lesson in English on Picture Composition to Form III. Five sectional meetings also were held in Aban last in which the following gentlemen read their papers and gave model lessons.

(1) ENGLISH SECTION :—

Mr. B. Srinivas Rao, B. A., Dip. Ed., read a paper on "Written Work, its value and method of assessing it."

(2) MATHEMATICS SECTION :—

Mr. A. B. Kamali, M. Sc., gave a model lesson to class V in Arithmetic.

(3) HISTORY & GEOGRAPHY SECTION :—

Mr. A. Husain Kidwai, M. A., read a paper on "The Teaching of Local History and its importance."

(4) ORIENTAL SECTION A :— (Arabic, Persian and Urdu)

Moulvi Yakub ur Rahman, Moulvi Kamil, read a paper on "The part played by conversation in the learning of a language."

(5) ORIENTAL SECTION B :— (Sanskrit and Telugu)

Mr. Virrasa Lingam Shastri, Vidwan & Siromani, read a paper on "The Advantages and Disadvantages of Translation and direct method of teaching Sanskrit."

As usual discussion took place after the papers and the model lessons in both the monthly and sectional meetings.

The Students' Union

After the election and nominations to the various offices of the Students' Union, Osmania Intermediate College, Warangal, an inaugural meeting was held in the college hall. Our principal, Mr. Ahmed Hussain Khan, addressed the union

The Teachers' Union 1349-50 and Brief Report of its Sections:—

Some changes have been recently introduced in the organization and working of our Teachers' Union. Two representatives of the Staff are selected this year to sit on the Managing Committee of the Union along with the Principal, and Vice-Principal, Ex-officio, and Chairmen of the different sections. The oriental section has been bifurcated into the Arabic, Persian and Urdu sections and the Sanskrit and Telugu sections, so that the teachers of oriental languages may discharge their work more efficiently.

The following are the office bearers of the Teachers' Union for the year 1349-50 F.

- | | |
|--|---|
| (1) PRESIDENT :— | Mr. Ahmad Husain Khan, B.A. Principal |
| (2) VICE-PRESIDENT :— | Mr. P.V.R. Sebastian, B.A. Vice-Principal |
| (3) GENERAL SECRETARY :— | Mr. Mohd. Abdul Aziz, M. A., B. T. |
| (4) CLUB SECRETARY :— | Mr. Mir Zainul Abidin, M. A., B. T. |
| (5) JOINT CLUB SECRETARY :— | Mr. Rangiah Naidu, B.A. |
| (6) CONVENOR OF THE ENGLISH SECTION :— | Mr. A. N. Jaddi, B.A., B.T. |
| (7) " " MATHEMATICS :— | Mr. A. V. Gopal Rao, M.A. |
| (8) " " HISTORY & GEOGRAPHY :— | Mr. Hashmatullah, M.A., LL.B. |
| (9) " " SCIENCE :— | Mr. Inayath Khan MSc. |
| (10) " " ORIENTAL (A) :— | Moulvi Samiuzzaman Saheb |
| (11) " " " (B) :— | Mr. Srinivas Rao, B.A. |
| (12) REPRESENTATIVES OF THE STAFF :— | Mr. Mohd. Azam, B.A., B.T. |
| (13) " " " " | Mr. A. B. Kamali, MSc. |

Hitherto we used to hold only the sectional meetings, but now we are having both the sectional and monthly meetings, according to a prescribed programme for the year. In the monthly meetings all the members of the staff participate; papers of general educational interest being read, and demonstration lessons being given, whereas in the sectional meetings only the members belonging to particular

THE Naksh-e-Avaleen

VOL. I

JANUARY 1941

No. 1

Foreword

The English section of the magazine reappears today after many months. The Principal thought it desirable that there should be given this opportunity to the students of the College to try their hand at this form of Composition. We do not claim that their efforts will at once place the author amongst the ranks of the "great", writers. But we do believe it is worth while to encourage them in their "First Steps", and if they find some pleasure and earn some profit from such exercises we shall be quite content. There are news and notes contributed by Members of the staff, and if some of them will write, well, we shall be glad to draw upon their literary talents. With this word or two, we send out our magazine in its new form.

Farewell to Mr. Mohd. Hafizullah

The Students and Staff of our College felt very keenly the separation from Mr. Mohd. Hafizullah, the Principal, on his transfer to the Osmania College, Aurangabad, as the Principal, after having been at the helm for a period of three years. Each group of students of the First year, Second year, Ninth and Tenth classes and Fourth, Fifth and Sixth forms entertained him to Tea, and also took a Group Photo on this occasion. Other students of the lower classes too were very anxious to give him a similar send off, but he could not accept their invitation for lack of time at his disposal.

A day before his handing over charge, the staff of the College arranged a fare well party, and a group photo in his honour. Some members spoke feelingly and some composed verses describing the commendable traits of his character, and the valuable work done by him during his stay here. Mr. Mohd. Hafizullah thanked the staff for the send off given to him, and spoke some words of advice.

ERRATA

Page	Line	For		Read
9	5	discomfortable	...	uncomfortable
9	6	be	...	been
9	14	maches	...	matches
9	35	stopped	...	stooped
9	37	s'range	...	strange
12	2	calesthenics	...	callisthenics
13	5	belive	...	believe
15	4	explant	...	excellent
15	4	throughoat	...	throughout
15	14	examvne	...	examine
15	15	moed	...	moved
15	16	pla	...	place
15	18	hisareces	...	his share
15	19	overt n ar	...	overturn a
15	23	scrumbled	...	scrambled
15	28	beautsu	...	beauties
15	29	dewdropy	...	dewdrops
15	30	shouh	...	shout
17	12	so	...	as
22	11	hubub	...	hubbub
22	23	Words Worth	...	Wordsworth
23	13	meterial	...	material
23	21	breaeze	...	breeze
23	31	than	...	when
24	33	&	...	and

We regret the number of errors that have crept into print owing to some mistake in proof reading. We hope our next issue will not be marred by such.

Ed.

CONTENTS

New Serial No. 4.

JANUARY, 1941.

Pages

1	Farewell to Mr. Hafizullah	...	} Mr. Md. Abdul Aziz	...	1
2	The Teachers' Union 1349 - 1350	...		...	2
3	The Students' Union	...	Hussain Ali, II year	...	3
4	Inaugural Address of the Principal to the Students' Union	...	Reported	...	6
5	Physical Activities	...	Mr. Saheb Hussaini	...	11
6	College vs. Officers—A Cricket Match...	...	Rangaraj, VI Form	...	12
7	My Trip to Mysore	...	Lokiah Naidu, II year	...	15
8	Their Highness the Prince and Princess of Berar in Warangal	...	K. V. Kishenrao, I year	...	17
9	My Cycle	...	P. Sadasivrao, II year	...	20
10	Town and Country	...	Sahebzada Mir Massood Ali Khan, II year	...	22
11	Tiger, Tiger, Burning Bright	...	A. Kishenrao, I year class	...	23

THE NAKSH-E-AVALEEN

The Osmania Intermediate College, WARANGAL.

—:O:—

Editorial Board.

—

1. Editor-in-Chief—Ahmad Hussain Khan Esq., B. A.
2. Editor—(English Section)—P. V. R. Sebastian Esq., B. A.
3. Editor—(Urdu Section)—Ahktar Hasan Esq., M. A.
4. Student Representatives—1. Baliguddin Hussain.
2. K. V. Kishen Rao.

Manager.

Mir Zainulabdin, M. A. B. T.

—

PRINTED BY B. V. R. BALREDDY & Co.—SECUNDERABAD.

نقش اولیں

